چاندنی کے سپرد
LENIN
انور قمر

چاندنی کے سپُرد

(افسانے)

انور قمر

بار اوّل : جون 1978

خوشنویس : نور محمد کریمی

سرورق : بشکریہ مدہوش بلگرامی

طباعت : پیراماؤنٹ آفسیٹ پریس ، بمبئی

قیمت : دس روپے

تقسیم کار : علوی بک ڈپو
49 ، محمد علی روڈ ، بمبئی 400003

مصنف کا پتہ : A 14 ، مہر آباد ،
31 ، ہل روڈ ، بمبئی 400050

چمن لعل سیسودیا، شمس کنول اور مدہوش بلگرامی

کے نام

جن کی علمی صحبت میرے ذہنی انقلاب

کا باعث ہوئی۔

ترتیب

قیدی

قیدیوں کے پیروں میں بیڑیاں ہیں اور ہاتھوں میں کُدالیں۔ ایک لمحہ میں کُدالیں فضا میں بلند ہوتی ہیں، دوسرے میں زمین کے پتھریلے سینے میں اُتر جاتی ہیں۔ قطعی میکانیکی طور پر یہ کام ہو رہا ہے۔ گجر بجتے ہی ایک وین ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر آکر رُکتی ہے۔ جمعدار دروازہ کھولتا ہے۔ یکے بعد دیگرے خانے دار موٹے کپڑے کی قمیص، نیکر اور ٹوپی پہنے قیدی وین سے اُترتے ہیں۔ بیڑیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں اور اُس وقت تک بجتی رہتی ہیں کہ جب تک وہ تمام قیدی ایک قطار میں چلتے ہوئے اپنے اپنے کام کرنے کی جگہ پر جاکر نہیں ٹھہر جاتے۔

میں دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لیے اور ڈبل روٹی منہ میں دبائے اُنھیں دیکھتا رہتا ہوں۔ نانا نے بتایا ہے کہ سڑک کے

کنارے لیمپ پوسٹوں کے کیبل بچھائے جائیں گے اس لیے نالا کھودا جا رہا ہے۔ میں خوش ہوں۔ سڑک پر روشنی ہو گی تو میں رات میں بھی سائیکل چلا سکوں گا۔ اب تو بتی جلتے ہی گھر واپس ہونا پڑتا ہے۔

امی کہتی ہیں۔ "شریف لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر آجاتے ہیں۔"

لیکن میرے نانا رات گئے تک اسپورٹس کلب میں بیٹھے تاش کھیلا کرتے ہیں۔ نانی مجھے اکثر انھیں بلانے بھیجا کرتی ہیں۔

اسپیڈ۔ فایو۔ ڈائمنڈ۔ سِکس۔ کلب ایٹ۔ نو ٹرمپ۔ کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں اور میں اپنے نانا کی پشت پر کرسی کا سرا پکڑے کھڑا ہوں اور بار بار اُن کی پیٹھ میں اُنگلی چبھو کر انھیں گھر چلنے کو کہتا ہوں۔

"شیخ صاحب۔ آپ کا نواسا آپ کو بلانے آیا ہے شاید!" یہ کہہ کر ایک بوڑھا چٹکی میں دبی ناس ناک میں سُڑکتا ہے۔

"ہوں" نانا اُس کی طرف دیکھے بغیر پتّا پھینکتے ہیں۔

میں اپنے نانا نانی کا لاڈلا اور اپنے ماں باپ کا ٹھکرایا ہوا ہوں۔ اس لیے وہ جمعدار جب بھی کسی قیدی کو ڈانٹتا یا سونٹے سے مارتا ہے تو وہ مجھے اپنے بے رحم باپ ہی کا ایک روپ نظر آتا ہے اور میں اپنے آپ کو ستم رسیدہ قیدی سمجھنے لگتا ہوں۔

میں پتنگ اُڑا رہا ہوں۔ پتنگ آسمان میں تارا بن گیا ہے۔ پیلا رنگ نیلے آسمان میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ میں چرخی ہاتھ میں لیے ڈور دیے جا رہا ہوں اور پتنگ چکراتا ہوا اونچا اور اونچا اُٹھا چلا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پتنگ اتنا بڑھ چکا ہے کہ اگر میں اُسے غوطہ دوں تو وہ اُس دیوار کے پرلی طرف بیٹھ سکتا ہے۔ دیوار ہماری کالونی کا احاطہ کرتی ہے۔ بہت دور تک چلی گئی ہے یہ دیوار۔ سائیکل پر اس کے متوازی چلتے چلتے مجھے آدھ گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ اور اونچی بھی بہت ہے یہ! جب تک میں اپنے مکان کی کھپریل کی چھت پر نہ چڑھوں مجھے اُس کے دوسری جانب کا کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ دیوار کی اُس طرف کیا ہے۔ باغ ہیں۔ کھیت ہیں۔ کنویں ہیں۔ کنوؤں پر رہٹ چلتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ میری Reader میں بنے ہیں۔ تکونے، رنگین۔ نازک سے۔

"دیکھو بالے کی پتنگ کتنی اونچی اُڑ رہی ہے۔"

میں اکڑ کر دو ہاتھ دھاگا کھینچتا ہوں اور پتنگ کا رُخ موڑتا ہوں۔

"کہاں یار؟" ایک قیدی، ہتھیلی سے آنکھ پر سایہ کر کے پوچھتا ہے۔

"وہ ... وہ رہی ..... اُس ببول کے ٹھیک اوپر ...."

"ہاں .... ہاں .... نظر آگئی .... نظر آگئی ...."

"واہ میاں خوب پتنگ اُڑا رہے ہو۔ اُستاد ہو گئے ہو۔"

میں پھول کر کُپّا ہو جاتا ہوں۔

"انور ......"

ایک گرج سُنائی دیتی ہے۔

"جی .... جی آیا ...."

"کھانا نکل گیا ہے۔ چلو جلدی۔"

ڈور ہاتھوں میں اُلجھنا شروع ہو جاتی ہے۔

"میاں پتنگ آہستہ آہستہ اُتارو۔ اور ڈور ایکجا نہ ہونے دو۔"

"جمعدار صاحب اس بچّے کی مدد کریں ہم۔" وہ قیدی ملتجیانہ نظروں سے جمعدار کو دیکھتا ہے۔

جمعدار آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کام جاری رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

"انور" میرا باپ پھر چیختا ہے۔

شاید اُسے چیخنے کا مرض ہے۔ اُس کے کمرے سے اُس کے دھاڑنے کی اور چیخنے چلاّنے کی آواز آتی ہی رہتی ہے۔ کبھی امّی پر برستا ہے تو کبھی خانساماں پر۔ کبھی صفائی والے پر غرّاتا ہے تو کبھی دھوبی پر۔ ہر کوئی اُس سے سہما سہما سا رہتا ہے۔ وہ مہینے دو مہینے میں بمبئی جاتا ہے۔ بمبئی جانے سے دو ایک روز پہلے وہ سب سے گھُلا مِلا رہتا ہے۔ یہی وہ چھوٹا سا عرصہ ہوتا ہے کہ جس کے دوران میں وہ مجھے اپنے قریب بلاتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ اُن دو دنوں میں میری امّی بھی بہت خوش رہتی ہیں۔ ہمارے گھر اُن دنوں اچھے اچھے کھانے پکتے ہیں۔

پھر وہ چلا جاتا ہے۔

اور مجھے جیسے امتحان بعد کی چھٹیاں مِل جاتی ہیں۔

لیکن یہ چھٹیاں جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ ہفتہ دس دن میں واپس ہو جاتا ہے۔ دُکھی، رنجیدہ، تھکا تھکا سا۔ جیسے امتحان میں فیل ہو گیا ہو۔

دوسرے ہی دن سے اُس کے کمرے سے دھاڑنے، چیخنے چلّانے اور غرّانے کی آواز سُنائی دینے لگتی ہے۔ اور پاس پڑوس کے رہنے والے امّی سے کہتے ہیں۔

"انور کے ابّا شاید واپس آگئے ہیں۔"

میرا ہاتھ تیزی سے ڈور پر چل رہا ہے۔ پتنگ لمحہ لمحہ اُترتا چلا آرہا ہے۔ اچانک ایک گرم سلاخ میری پیٹھ پر پڑتی ہے۔ میں تلملا کر پیٹھ مَلنے لگتا ہوں۔ پتنگ بھیگا بھیگا سا نظر آتا ہے۔ چرخی ہاتھ سے چھین کر پٹخ دی جاتی ہے۔ پھر کسی کا بھاری پیر اُس پر پڑتا ہے۔ کسی کے پنجے پتنگ کو پُرزے پُرزے کر دیتے ہیں۔ دو آنکھیں چشمے کے پیچھے سے آگ اُگل رہی ہیں۔ قمچی سانپ بن کر لہراتی ہے اور میرے گلے اور سینے پر آپڑتی ہے۔ اچانک اُن آگ اُگلنے والی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں دیکھتا ہوں۔ اُٹھا ہوا ہاتھ رُک جاتا ہے۔ میری آبدیدہ آنکھیں دیکھتی ہیں کہ۔

کُدالیں فضا ہی میں بلند ہیں۔ وہ نیچے نہیں آتیں۔ وہ ایک دہشت ناک احتجاج بن گئی ہیں۔ کُدالیں اُٹھائے ہوئے قیدیوں کی نگاہوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔

میرا باپ چور نظروں سے اُنھیں دیکھتا ہے۔ پھر میرا ہاتھ

پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔

میں گھٹنوں میں سر دیے ہچکیاں لے رہا ہوں اور قمچی کا ہر وار میری پیٹھ چاک کر رہا ہے۔

نانی دوڑتی ہوئی آتی ہیں۔ ایک شور مچتا ہے۔ بحث ہوتی ہے واسطے دیے جاتے ہیں۔ "بچہ مر جائے گا۔ خدا کے لیے بخش دو۔"

میں دیوار سے ٹیک لگائے کچھ دیر بیٹھ پاتا ہوں۔ پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہوں۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے۔ میں کھڑکی سے پرندوں کو اپنے مسکن کو واپس ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میرا ہاتھ دھیرے دھیرے پیٹھ کے زخموں کو چھو رہا ہے۔ اُن پر مرہم لگایا جا چکا ہے۔ لیکن ٹیسیں اب بھی اُٹھ رہی ہیں۔

وقت گذرتا چلا جا رہا ہے۔ سارے میں تاریکی پھیل گئی ہے۔ جھینگر سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ وہ گدالیں فضائیں معلق ہیں۔ ہزار ہا آنکھ سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ ایک بچے کو کوئی جابر گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔

نانی دبے پاؤں کمرے میں آتی ہیں۔

اندھیرا۔ مکمل اندھیرا۔

"انور.... انور.... بیٹا دودھ پی لے... اُٹھ بیٹے... اُٹھ۔"

میرے پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔

نانی کا ہاتھ ٹٹول کر میں پیالہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہوں۔

اور مُنہ سے لگا لیتا ہوں۔ گرم اور میٹھے دودھ کا ہر گھونٹ نانی کے ڈھارس بندھانے والے جملوں کی طرح مجھے آسودگی بخش رہا ہے۔

دوسرے روز گجر بجتے ہی وہ ویَن ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر آکر رُکتی ہے۔ زنجیریں کھنکتی ہیں۔ بیڑیاں بجتی ہیں۔ قیدی ایک قطار میں چلتے ہوئے اپنے اپنے کام کرنے کی جگہ پر جاکر ٹھہر جاتے ہیں۔

جمعدار حکم دیتا ہے۔ "کا۔ آ۔ آ۔ م شرُو۔"

تمام کُدالیں ایک ساتھ ہوا میں لہراتی ہیں اور زمین کے پتھریلے سینے میں دھنس جاتی ہیں۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے میرے سینے میں درد کروٹیں لینے لگتا ہے۔ ایک چٹان کوئی شخص پوری قوت صَرف کرکے کھائی میں لُڑھکا دیتا ہے۔ مُٹھیاں بھِنچ جاتی ہیں۔ اعصاب تن جاتے ہیں۔

چاروں طرف گُلال بکھرا نظر آتا ہے۔ میں سائیکل اُٹھاتا ہوں اور گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ کالونی کے مغرب میں ایک چوکی ہے۔ وہاں ایک چوکیدار ہمیشہ پہرہ دیا کرتا ہے۔ آج بھی وہ وہاں چاق چوبند کھڑا ہے۔

میں اُس خاکی وردی پوش مجسمے کے قریب جاتا ہوں۔

"کیوں بابا تم یہاں تک آگئے؟"

"اوں.... بس ایسے ہی..... مجھے باہر جانا ہے...."

میں کھُلی اور کشادہ سڑک کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

"نا۔ نا.... جاؤ.... واپس جاؤ.... بچے سڑک پر نہیں جاتے.... سڑک پر موٹریں چلتی ہیں.... جاؤ...."

یہ کہتے کہتے وہ میری سائیکل کا رُخ اُلٹا پھیر دیتا ہے اور

دو قدم میرے ساتھ چلتا ہے۔ میں بے بسی سے اُسے دیکھتا ہوں۔ اور غصہ میں دوڑ کر سائیکل پر سوار ہو جاتا ہوں اور پھر زور زور سے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا ہوں۔

پیر بڑی تیزی سے چلنے لگتے ہیں۔ پہیے دُگنی رفتار سے گھومنے لگتے ہیں۔ اسی تیز رفتاری سے میں کالونی کے مشرقی سرے پر پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں ایک پتھر کی بنی عمارت ہے جس میں سے کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ کی آوازیں اُبھرتی رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی غیر کو اُس کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ عمارت کا کوئی دروازہ نظر نہیں آتا۔ عمارت کی کھڑکیوں پر لوہے کی جالیاں لگی ہیں۔ اندر روشنی ہو رہی ہے۔ خاکی وردی والے بیس بیس قدم پر سنگین چڑھی رائفلیں لیے پہرہ دے رہے ہیں۔

میں ایک سپاہی کے قریب جاتا ہوں۔

"میں اپنے نانا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"نانا سے ؟"

"ہاں۔ وہ اس میں کام کرتے ہیں۔" میں اُنگلی سے عمارت کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

"کیا نام ہے ؟"

"شیخ صاحب"

"ہوں۔ کس کھاتے میں کام کرتے ہیں ؟"

"کھاتا ؟" میں وہ لفظ دہراتا ہوں۔

"ہاں ہاں۔ جیسے پرنٹنگ، پروف ریڈنگ، ڈائی میکنگ، فاؤنڈری، ٹریژری، کیش آفس، مینٹیننس، بوئیلر پلانٹ۔۔۔۔۔"

"بوئیلر پلانٹ۔۔۔" یہ لفظ میرے ذہن سے چپک جاتا ہے۔

"بوئیلر پلانٹ۔۔۔۔" میں بڑبڑاتا ہوں۔ بغیر کچھ کہے چپ چاپ سر جھکائے میں وہاں سے چل دیتا ہوں۔

کافی دور تک مجھے اُس پر اسرار عمارت کے متوازی راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ عمارت کے اندر سے کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ کی بے ہنگم آواز مجھے بدستور سُنائی دے رہی ہے۔

ایک مقام پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار، وہ لمبی چوڑی دیوار، اس عمارت کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور اب ایک ناقابلِ عبور منزل کی طرح میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں چُپ چاپ اُسے تاکتا کھڑا رہتا ہوں۔

پھر واپس ہوتا ہوں۔ اب میرا رُخ کسی اور سمت نہیں بلکہ گھر کی طرف ہے۔

سائیکل کے پہیے کی سُست رفتاری گرم دوپہر میں بدل گئی ہے۔

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟؟

اکثر مکانوں سے لوگ باہر نکل آئے ہیں۔ اور دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ نانی، امّی، ابّا، خانساماں سب مکان سے باہر کھڑے ہیں۔ میں اُن کے قریب پہنچنے سے چند قدم پہلے ہی سائیکل سے اُتر پڑتا ہوں اور دبے پاؤں اُن کے قریب جاتا ہوں۔

کوئی مجھ سے کچھ نہیں کہتا۔
ابّا بھی مجھے نہیں ٹوکتے۔ نہ مجھے دیکھتے ہیں۔
میں آنکھ بند کر کے اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ پھر سائیکل باغیچہ میں کھڑی کر کے ان میں جا ملتا ہوں۔
"کہیں نہیں جا سکتے ___ گھنٹے دو گھنٹے میں دھر لیے جائینگے۔"
میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری نظریں کسی کو تلاش کرنے لگتی ہیں۔ کُدالیں کھُدی ہوئی زمین پر بکھری پڑی ہیں۔
"ظالموں نے جمعدار کو گرا گرا کر مارا ہے۔ سر پھٹ گیا ہے غریب کا۔"
میں بظاہر بے تعلقی سے ہر ہر لفظ پر کان لگائے ہوں۔
"اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اب تک بے ہوش ہے۔"
"پتا نہیں کیسے سالوں نے اپنے پیروں کی بیڑیاں کاٹ لیں اور دیوار پھاند کر بھاگ گئے۔"
"دھر لیے جائیں گے سالے ... دھر لیے جائیں گے۔"
میرے باپ کا آخری جملہ مجھے بالکل بے معنی سا لگ رہا ہے۔
لیکن وہ جملہ
"پیروں کی بیڑیاں توڑ لیں اور دیوار پھاند کر بھاگ گئے۔"
کانوں میں گونج رہا ہے۔
مجھے خیال آتا ہے کہ میں دونوں ہاتھ تتلی کی طرح لہراتا سائیکل چلا رہا ہوں۔

میرا پتنگ بہت بلندی پر اُڑ رہا ہے جس کی ڈور کسی کے ہاتھ میں نہیں بلکہ صرف میرے ہاتھ میں ہے۔ پتنگ اونچا اور اونچا اُٹھتا چلا جا رہا ہے۔

"انور!"

جیسے کسی نے میرے دل میں دہکتی سلاخ گھُسیڑ دی ہو۔

"چلو گھر میں۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

کوئی خوں خوار نظروں سے مجھے گھور تا ہے۔

اور میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم جاتا ہے۔

ہاتھ بلند ہیں۔ کدالیں ہوا میں اُٹھی ہوئی ہیں۔ سبھوں کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھُوٹ رہی ہیں۔

اور میں سوچتا ہوں۔

کہ مجھے فوراً کسی سے بیڑیاں کاٹنے کا ہُنر سیکھ لینا چاہیے۔

سنہ ۱۹۷۷ء

گرمی[1]

ایک بے ضرر سی پھنسی چند روز میں گھاؤ کی شکل اختیار کر چکی تھی اور وہ گھاؤ اب ایک رِستے ناسور میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک کیکڑا نما ناسور کہ جس کے بیچ میں ذرا سا شگاف تھا اور اس شگاف کے اطراف کی جلد سخت ہو چکی تھی اور سُرخ بھی !

بھاری پیروں سے وہ پیشاب خانے کے باہر آیا۔ قینچی مارکہ سگریٹ جیب سے نکال کر منھ سے لگائی۔ پھر ماچس نکالی۔ ماچس خالی تھی۔

"اس کی ماں..." اس نے ڈبیہ داہنی طرف اُچھال دی۔

باپٹی روڈ کے ناکے پر واقع بیڑی والے کی دُکان پر رُک کر جوٹ کی سلگتی رسّی سے اُس نے سگریٹ سُلگایا اور وہیں کھڑے کھڑے دو کش لیے۔ بھاری پیروں سے وہ آگے بڑھا اور بائیں طرف شکلاجی اسٹریٹ میں مڑ گیا۔ سڑک کے بائیں طرف داؤد باغ تھا اور دائیں طرف تھے

---

[1] SYPHILIS

ویشیاؤں کے کٹہرے۔ چھوٹا سا داخلی دروازہ ، اندر اونچا پلنگ ، پلنگ پر میلے چیکٹ گدّے ، گدّوں پر گہرے رنگ کی چادر۔ آڑی ٹیڑھی صورتوں کی عورتیں ، تنگ بلاؤز اور گھیردار لہنگا پہنے ، راہ گیروں کو تاکتی اُسے نظر آئیں۔

"ان کی ماں ... مادر ... نے میری زندگی تباہ کر کے رکھ دی۔"

آخ ... خ کی آواز بہت کھنچی۔ پھر اس نے بہت سا بلغم ان کی طرف تھوک دیا۔

"اُس بھڑوے کو دیکھو۔" ایک نے ہاتھ لہرا کر اُس کی طرف اشارہ کیا۔ "حرام کے جنے کا ہم نے کچھ کھایا ہو جیسے !"

دوسری نے مُسکرا کر اس کی حرکت نظر انداز کی اور پیشہ ورانہ انداز میں ربر کے گُڈّے کی طرح گردن اوپر نیچے ہلانے اور لہنگا بھی اُچکانے لگی۔

وہ خوں خوار نظروں سے انھیں گھورتا آگے بڑھ گیا۔

"آجا میری برباد محبّت کے سہارے ، ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے۔" نورجہاں بہ آواز بلند فریاد کر رہی تھی۔ سائیکل کی دوکان پر پہیے کے گھیرے کی گولائی ٹھونک ٹھونک کر درست کی جا رہی تھی۔ پسینے میں تر ایک بوڑھا کبابی کچّے قیمے کی ٹکیاں ہتھیلی پر جما جما کر کڑکڑاتے تیل میں چھوڑ رہا تھا اور ٹکیاں پلوں میں بھوری مائل ہوتی جا رہی تھیں۔

اپریل کا مہینہ ـــــ دوپہر کا وقت ـــــ بمبئی کی گرمی ـــــ پسینے کی پتلی سی دھار اسے اپنی پیٹھ پر بہتی محسوس ہوئی۔ کسمسا کر

جلد سے چپکی ہوئی نائیلون کی قمیض اُس نے الگ کی۔
دفعتاً اُسے اپنے جسم کے اس مخصوص عضو پر بیٹھے سنگین پیٹھ والے کیکڑے کا پھر خیال آیا ___ آخر مجھے کب اس کیکڑے کی مہلک گرفت سے نجات مِلے گی ؟
وہ تو ایک بے ضرر سی پھنسی تھی۔ چند روز میں اُس نے ایک گھاؤ کی شکل اختیار کرلی اور پھر وہ گھاؤ ایک رِستے ناسور میں بدل گیا ___ اُف ! کتنا بدبودار فاسد مادہ خارج ہوتا ہے اس سے ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جسم کی تمام قوت قطرہ قطرہ ہوکر اس راہ سے بہہ نکلے۔
اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ___ سر کا پسینہ گردن پر سے گذرتا ریڑھ کی ہڈّی پر ٹھنڈا ٹھنڈا پھر سے بہنے لگا ___ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے۔ اور جسم بالکل بے وزن سا محسوس ہونے لگا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی راہ کیوں کر طے کررہا ہے .... خیراتی اسپتال کی راہ ... اس کے لاشعور میں اس اسپتال کا سنگین اور بے حس وارڈ سینکڑوں کرّاہیں لیے موجود تھا ___ لمبی قطار ___ لمبوترے چہرے ___ لمبوتری ناک ___ لمبوترے دانت ، لمبے ناخنوں اور لمبی بیماریوں کے ساتھی مریض ___ پندرہ لاکھ پوٹنسی (POTENCY) کی تیل آمیز پینی سلین پام ....
"سالے انجکشن کاہے کو لیتا ہے ___ یہ مَلم لے جا ___ اور لگا اس پر ___ جلدی اچھا ہو جائے گا ___ دیکھتا نئی ہے ___ کِتنی

جاڑی سوئی مارتا ہے وہ کھڑوس ڈاکٹر؟"

"آ..... آہ ..."

ایک دبی دبی سی چیخ انجکشن لیتے ہوئے مریض کے منھ سے نکلی۔ ڈاکٹر نے ابھی ابھی اس کے بازو میں سوئی گھونپی تھی۔

اسماعیل لرز کر رہ گیا۔ ایک روپے کا نوٹ اپنے مخاطب کو تھما کر وہ اس انجکشن کی سر بہ مہر شیشی گھر لے آیا۔

رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ پاٹ اُٹھائے جب انہی بھاری پیروں سے پاخانے کی اُور چلا تو اُس کے پاجامے کی جیب میں وہ شیشی جھول رہی تھی ــــ آٹھ دس کمرے چھوڑ کر چالی کی لڑکیاں ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ دیے بیٹھی تھیں۔ جب وہ ان کے قریب سے گذرا تو وہ کِھلکھلا کر ہنس دیں ــــ اس ہنسی کے ساتھ ساتھ ان کے جسموں سے اُٹھتی ہوئی کچے آموں کی خوشبو بھی اس کی حِسوں سے ٹکرائی ــــ اس کے ذہن کے کسی حصّے پر کہکشاں سی گِری۔ اچانک اُس کے دامن میں اُبھار پیدا ہوگیا ــــ اس کا جی چاہا کہ چالی کی یہ نیم تاریک راہ لمبی اور لمبی ہوتی چلی جائے ــــ اور جہاں یہ ختم ہو، وہاں ہو کُھلا میدان ــــ اور آسمان پر ہوں ستارے اور اس کی گود میں ہوں آم کی یہ پٹاریاں۔

پہلی دوسری اور پھر تیسری شیشی کا مرہم وہ اپنے زخم پر مسلسل لگاتا رہا اور آٹھ دن تک اس کا چمتکار دیکھنے کا منتظر رہا لیکن جو زہر خون میں حل ہوکر اس درخت کی جڑوں میں پرورش پانے والے

جراثیموں کو فنا کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا، وہ کیوں کر اس کی شاخ کے زخم پر ایک اکسیر مرہم کا کام کر سکتا تھا۔ وہ قطعی بے اثر ثابت ہوا۔

اس نے جیب سے دوسری قینچی نکالی۔ ایک بیڑی کی دوکان پر جلتی چمنی میں کانپتی اُنگلیوں سے تھامی ہوئی کترن ڈبوئی اور پھر اس کی مدد سے اپنا سگریٹ سلگا لیا۔

لمبا کش ـــــ جس کے سرور سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

سڑک پر اطراف کی تمام گلیوں اور محلّوں کا کوڑا ڈھیر تھا ـــــ بدجانوروں سے مشابہت رکھنے والے بچےّ اس ڈھیر کو کرید رہے تھے ـــــ وہ اوبڑ کھابڑ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب وہ گھر سے بینگن کا بھرتہ، ماش کی پھریری دال اور تہاری کھاکر لوٹ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک ٹیکسی ڈرائیور پر پڑی کہ جو سڑک کے ایک جانب کھڑی اپنی ٹیکسی میں بیٹھا تھا اور ایک کسے بدن کی سانولی سلونی عورت سے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کیے جا رہا تھا ـــــ وہ بھی دانتوں میں پلّو لیے اس سے کوئی گمبھیر معاہدہ کر رہی تھی۔

اس کے کانوں کی لویں گرم ہوگئیں ـــــ جلد ہی سے اُس نے اپنی قمیض کا دامن کھینچ کر پتلون سے باہر کر لیا۔

پھر تو کارخانے کو آتے جاتے وہ اس سانولی سلونی کسے بدن کی عورت کو تاکا کرتا۔

اور ایک دِن صبح سویرے کہ جب وہ ڈیوٹی کو جا رہا تھا کہ

اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بالوں سے پانی جھٹک رہی ہے اور اس کی بغل میں دو موٹے موٹے سفید کبوتر دبے ہیں ۔ ایک لمحہ کے لیے وہ وہیں رُک گیا ۔ اسی لمحہ اس کا تصور اسے اس عورت کے پاس لے گیا اور جاتے ہی اس نے ان کبوتروں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھر لیا ۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں ۔ آنکھوں کے سامنے مخملی اندھیرا سا چھا گیا ۔ سرخ ، ہرے ، پیلے ، سنہری رنگ اس اندھیرے میں ایک دوسرے سے لپٹنے لگے ۔

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی بالوں سے پانی جھٹک رہی تھی کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کسی کی نظریں اس کی بغلوں میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں ۔ تیزی سے الگنی سے تولیہ کھینچ کر ، اس نے اپنے سینے پر ڈال لیا ۔ اور پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی ۔

پھر تو وہ کبوتر وہاں سے اُڑے اور اس کے سر پر ایک ہم رو کی طرح پرواز کرنے لگے ۔ کبھی وہ اسے کسی عمارت پر بیٹھے نظر آتے ، تو کبھی کسی دُکان پر ۔ کبھی اس نے انھیں کسی راہ گیر کے سر پر بیٹھا دیکھا تو کبھی کسی موٹر کے مڈگارڈ پر ۔ پریشان تو وہ اس وقت ہوا کہ جب وہ کبوتر اسے اپنے کارخانے میں مستری کی میز پر بھی بیٹھے نظر آئے ۔

بے بس ہو کر اس نے چھٹی لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی ۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ آج کام پر قطعی دھیان نہیں دے سکتا ۔ اس لیے اپنی بہن کی نسبت طے کیے جانے کے موقعے پر موجود رہنے کا بہانہ بنا کر اس نے چھٹی لے لی اور سینٹرل اسٹیشن کے ایک ویران

پلیٹ فارم پر بچھے بنچ پر جا بیٹھا۔

وہ کبوتر اب پلیٹ فارم پر اُتر آئے تھے ــــ کبھی وہ اُڑ کر چھت پر جا بیٹھتے تو کبھی ریل کی پڑی پر! دو موٹے موٹے سفید کبوتر!

نہیں یہ بدکاری مجھ سے نہیں ہو گی ــــ وہ رنڈی ہے۔ بُری عورت ہے ــــ لیکن کتنی خوب صورت ہے وہ ــــ اور اس کا جسم ــــ اُف ــــ اور وہ کبوتر ــــ بڑے بڑے سفید کبوتر ــــ نہیں نہیں یہ گناہ ہے ــــ بُرے لوگ ہی ان کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن وہ کتنے پیار سے مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی اور وہ کبوتر ــــ؟ ایسے کبوتر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ــــ ایسے کبوتر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے.... ایسے کبوتر....

ایک دُم دار ستارہ فلک کے کسی حصہ سے اُبھر کر اس کے سامنے آیا ــــ آں ــــ ہاں ــــ قدسیہ خالہ ــــ جھولے پر ہم بچوّں کے بیچ بیٹھا کرتی تھیں ــــ ان کے بازو ہمارے شانوں پر ہوتے تھے ــــ اور جب کبھی کوئی بات انھیں لطف دے جاتی تو ایک پھلجڑی سی چھوٹتی ان کے منہ سے! اور پھر وہ ہمیں کس کر اپنے سینے سے لگا لیتیں۔ کبوتر دب جاتے ــــ اور ہمیں ان کا گداز اور گرم لمس کتنا اچھا لگتا۔ ایک مرتبہ تو وہ میرے خواب میں بھی آئیں تھیں ــــ ایک راجکماری کے روپ میں۔ تو کیا میں اسے ان کا بدل سمجھوں؟ نہیں.... نہیں.... قدسیہ خالہ.... اس سے بڑھ کر اور کون سا گناہ ہو سکتا ہے؟

ایک خالی ریل گاڑی دو پلیٹ فارم چھوڑ تیسرے کے احاطے میں

دبے قدموں داخل ہوئی۔ اسماعیل کو اُس رات کی بات یاد آئی۔

وہ بستر پر آنکھیں بند کیے دراز تھا اور اُس کے والد کہہ رہے تھے، "کوشش میں ہوں، کسی اچھے علاقے میں کوئی جگہ مِل جائے۔ یہاں تو چاروں طرف رنڈیوں کے کوٹھے ہیں۔ راہ چلنا دُشوار ہے۔ قدم قدم پر بھڑوے راستہ روکتے ہیں ــــ اب اسماعیل جوان ہو چکا ہے ــــ پتہ نہیں کب قدم بہک جائے اس کا!"

اس کی ماں نے انھیں پان پیش کرتے ہوئے کہا:

"نہیں جی، اتنی فکر مت کیجیے ــــ اسماعیل بہت سمجھ دار ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔"

تو کیا یہ کوئی غلط کام ہے؟ چوری، دھوکہ بازی، بے ایمانی جیسا؟ لیکن اس آتش فشاں کا لاوا جو کھول کھول اُٹھتا ہے؟ آخر کب تک میں اسے اپنے ہاتھوں کی راہ بہاتا رہوں؟ اپنے مخرج سے نکل کر کبھی تو یہ سمندر میں گرے! کب... کب... وہ کبوتر... وہ سفید کبوتر.... بغیر کوئی فیصلہ کیے وہ وہاں سے رخصت ہوا۔ اس وقت اسٹیشن کے گھڑیال میں ایک بج رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اُس نے کھانا کھایا اور طبیعت میں گرانی کی وجہ ماں کو بتا کر بستر پر لیٹ گیا ــــ وہ کبوتر اس کے کان میں غٹرغوں کرتے رہے اور مستی میں آکر رقص بھی کرتے رہے۔

کوئی چھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ اُس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے ماں سے نہانے کا پانی گرم کرنے کی درخواست کی اور خود

دیوار سے ٹیک لگائے بستر ہی پر بیٹھا رہا۔۔۔ چال میں چہل پہل تھی۔ وہ لڑکیاں ٹھٹھا مار کر ہنس رہی تھیں ۔ جب کوئی اس کے کمرے کے سامنے سے گذرتی تو ایک نظر اندر بھی ڈال دیتی ۔۔۔ اور وہ سوچتا اس آم کی پٹاری سے کتنی مہک اُٹھ رہی ہے۔

نہاتے ہوئے اُس نے اپنے آپ پر بہت قابو رکھا۔ ان لمحوں میں کبوتروں کو مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش بڑی شدید تھی۔ لیکن اس کی ہزار 'ہاں' پر آج صرف ایک 'نہیں' بھاری تھی ۔۔۔ ایک گھنے بالوں والا ہاتھ بار بار اس کی طرف بڑھتا اور یہ اپنی پوری قوت صرف کر کے اس ہاتھ کا رُخ موڑ دیتا۔

نہا دھوکر سر میں تیل ٹپکا کر جب وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنانے لگا تو اُسے اپنے چہرے پر خلاف معمول بڑی تمازت اور تازگی نظر آئی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ آج اُس نے اس ریچھ کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اس کا پنجہ مروڑ کر شکست دے دی۔

لیکن ۔۔۔ نہ جانے کس سمت سے وہ سفید کبوتر کمرے میں آدھمکے اور آئینہ کے اوپری سرے پر جا بیٹھے ۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔۔۔ کانوں کی لوؤں سے خون ٹپکنے لگا ۔۔۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ جسم اینٹھنے لگا۔

"نہیں نہیں۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔

میں انھیں مات نہیں دے سکتا ۔۔۔ میں ان کے سامنے اپنے آپ کو بے حد پست ہمت اور حوصلہ شکن پاتا ہوں۔

ماں کی پروسی ہوئی چائے پی کر وہ گھر سے باہر نکلا۔ مکان کی

چھتوں اور کارخانوں کی چمنیوں کے درمیان میں کھڑے ناریل کے درخت پر اس کی نظر پڑی ـــــ درخت ہوا میں ڈول رہا تھا ـــــ اور اس پر وہ کبوتر بیٹھے ہوئے تھے ـــــ

"اللہ اکبر" جوں ہی اذان ہوئی ان کبوتروں نے قلانچ ماری اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے ـــــ کہاں چلے گئے ؟ ـــــ کہاں چلے گئے ؟

ان کے جانے سے اسے بہت خوشی ہوئی۔ مانو سر کا بوجھ ہلکا ہوگیا ـــــ سینے پر سے بھاری پتھر اُٹھ گیا ـــــ اس نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ عبادت اور بندگی سے مجھ میں یقین کی قوت اور ایمان کی گرمی از سرِ نو پیدا ہو جس کی بدولت میں ان نفس پرور پرندوں سے نبرد آزمائی کرسکوں۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اُٹھ گئے ـــــ

وضو کرکے بڑے خضوع وخشوع سے وہ نماز ادا کرنے لگا ـــــ فرض کی ادائیگی کے دوران میں خالق کائنات سے اپنا ناتہ جوڑتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کمتر اور ذلیل محسوس کرنے لگا ـــــ اس عظیم المرتبت، عظیم القدر، عظیم الشان ہستی کے آگے اس نے اپنے آپ کو بے مایہ، بے کس، بے وقعت اور شرمسار پایا۔

ان تین رکعت نماز کی ادائیگی کے بعد اسے اپنے قلب میں بے پناہ سکون محسوس ہوا۔ جس کی راحت کے زیر اثر دعا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

کچھ دیر رُک کر اُس نے دو رکعت سنّت پڑھی۔

اور

جب وہ آخری دو رکعت نفل پڑھنے بیٹھا تو وہ کبوتر سجدہ گاہ سے نمودار ہوئے اور ممبر پر جا بیٹھے ـــــ

انھیں دیکھتے ہی اس کے اعضاء شل ہو گئے اور جسم بے وزن محسوس ہونے لگا ـــــ

جب

مسجد سے اس کے قدم باہر نکلے تو اس کا رُخ اپنے مکان کی طرف نہیں تھا ....

اس بات کو گذرے ہوئے دو مہینے بیت چکے تھے ـــــ

آج اسماعیل اسی راستے خیراتی اسپتال کو جا رہا تھا ـــــ

اور دو کبوتر بہت بلندی پر اس کے سر پر پرواز کر رہے تھے۔

۱۹۷۷ء

چاندنی کے سپُرد

چاندنی مرطوب مزاج ہوتی ہے۔ زخم کے حق میں مُضر ہوتی ہے۔ اگر کوئی زخمی یا زچہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں چاندنی پہونچتی ہو اور مریض کو وہاں سے منتقل نہ کیا جا سکتا ہو تو سات پولے جلا کر ایک آدمی کو گواہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"ہم نے اس زخمی کو تیرے سپُرد کیا۔"

دوسرا آدمی کہتا ہے:

"میں اِس بات کا گواہ ہوں۔"

یہ ایک ٹوٹکا تھا جو کسی زمانے میں مروج تھا۔

لاچار ہو کر کلوّا نے جیب سے رومال نکالا اور ڈھاٹے کی طرح اپنے منہ پر کس کر باندھ دیا۔ سڑاند کا زور کچھ کم ہوا۔ اس سے پہلے

وہ بدبو کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس کی ہر حرکت اُسے کیچڑ میں زیادہ دھنسائے جا رہی تھی۔ گاؤں کی ٹیکریوں پر اُسے سؤر فضلہ سونگھتے، چکھتے اور کھاتے یاد آئے۔ اُس وقت وہ بھی اُن میں سے ایک ہو گیا تھا، جسے بمبئی کے مہالکشمی اسٹیشن سے پونہ تک اُس بد جالنور کے رول کو ادا کرنا تھا۔

GOODS - TRAIN کے ویگنس شہر کی غلاظت کسی فرٹیلائزر کمپنی کو پہونچانے تیار کھڑے تھے۔ اُن میں ایک ویگن کا اضافہ ہونا باقی تھا اور وہ تھا باندرہ سلاٹر ہاؤس سے آنے والا چھوٹے، بڑے اور بد جالنوروں کے خون سے بھرا ہوا ڈبہ۔ اُسے اپنے وقت کے مطابق اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ لیکن . . . .

نو بج رہے تھے۔ بمبئی کا سورج شہر ہی کی سی برق رفتار زندگی کے PACE پر کلوا کے سر پر شعاعیں پھینک رہا تھا۔ یہ تیز کرنیں کلوا کے سر پر پڑی سیاہ کیپ کے آرپار تو نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ لیکن اُسے گرما کر اُس کے تیل آلودہ بالوں میں پسینے کی چپچپاہٹ ضرور پیدا کر رہی تھیں اور ساتھ ہی پچھلے تین دنوں کے باسی کچرے میں FERMENTATION پیدا کر کے تیزاب بنا رہی تھی۔ جو لوہے کے بنے ویگنس کو کسی OXY ACCETALINE FLAME کی طرح دھیرے دھیرے چاٹ رہا تھا۔

رنگ و نور میں نہائے ہوئے اس شہر کی غلاظت بھی انقلاب سے پہلے کے شہر شنگھائی کی سی ہو گئی تھی کہ جب دوسری عالمگیر جنگ میں

جہاں اُس شہر کا تمام شہری نظام درہم برہم ہوا تھا، وہیں حفظانِ صحت کا محکمہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اُس وقت اُس شہر میں تقریباً چار روز تک بھنگیوں نے پاخانے کی کنڈیاں، گٹریں اور سڑکیں صاف نہیں کی تھیں۔

کلوا کے لاشعور میں ڈر پیدا ہو چلا تھا کہ اب وہ اپنی بیوی کے بالوں میں مہکتے ہوئے موگرے کی تعریف نہیں کر سکتا۔ وہ اُن ادھ کھلی کلیوں کی نزاکت اور دلکشی سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ شب اُس کی نظریں بیوی کے بازو میں لیٹے لیٹے بار بار چھت پر چپکی اُس چھپکلی کی طرف اُٹھ جاتی تھیں، جو کیڑے مکوڑے کھا کھا کر سُست ہو گئی تھی اور پلکیں تک نہیں جھپکا رہی تھی۔

بیوی کے اپنی طرف متوجہ کرنے پر اُس نے کروٹ بدلی تھی اور پھر دیوار کے ایک کونے میں تنے مکڑی کے جالے کو تاکنے لگا تھا۔

اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے اب وہ گندی ہی تلاش کرنے لگا تھا۔ گھر آتے جاتے وہ مچھلی مارکیٹ کی طرف سے گذرنے لگا تھا۔ وہ جب بھی کسی بدوضع موٹی کالی کلوٹی عورت کو دیکھ لیتا تو اس کے دل میں اُس سے مباشرت کرنے کا جذبہ موجیں مارنے لگتا اور جب اُس کے نتھنوں میں کوئی بدبو سرایت کر جاتی تو وہ جان بوجھ کر اُس فضا سے نکلنے میں وقت لیتا۔

باسی کھانے، بدمزہ کھانے، بادی پیدا کر دینے والے کھانے اُسے پسند آنے لگے تھے۔ اُس نے داڑھی چھوڑ دی تھی۔ زیرِ بازو اور زیرِ ناف بال بھی وہ نہیں تراشتا تھا۔ ناک میں دیر تک اُنگلی کرنا

اور کام پر سے لوٹنے کے بعد کینو اس کے جوتے اور نائیلون کے موزے سونگھنا اُس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

یعنی اُس کچرا گاڑی کی سات سالہ ملازمت نے چست و چالاک، ذہین و صحت مند، نفاست پرست اور سلیقہ مند کلّو رام کو غبی، سُست، کند ذہن، بیمار، بدذوق، کاہل اور کلوا بنا دیا تھا۔

"سفر کیسا کٹا مادام؟"

"اوہ، فائن!"

"کسی قسم کی کوئی تکلیف؟"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوئی معزز شخص آگے بڑھ آیا تھا اور آتے ہی اُس نے اُن کا ہاتھ مصافحہ کے لیے تھام لیا تھا۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ اُتنی ہی تھی جتنی کسی جنتا یا کسی پسینجر ٹرین کی آمد کے وقت ہوتی ہے۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ اس اسپیشل ٹرین سے صرف ایک ہی مسافر اُترا تھا اور جو اُس وقت پلیٹ فارم کے اِس کونے سے اُس کونے تک بچھے سُرخ قالین پر چلتا ہوا اسٹیشن کے باہر کھڑے موٹروں کے کارواں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"تو پھر اِس قدر بھیڑ وہاں کیوں جمع تھی؟"

اُس بھیڑ میں بہتیرے اس کے محافظ تھے۔ جو ذہن اور نظر سے ہر شخص کے وجود کو اس طرح اُلٹ پلٹ رہے تھے کہ جس طرح کوئی چرم فروش بھیڑ بکریوں کی کھالوں کو محفوظ کرنے کے لیے نمک لگاتے ہوئے

اُلٹتا پلٹتا ہے۔

"اُس بھیڑ میں اور کون کون شامل تھا؟"

"بڑے بڑے بزنس مینوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور ان پستہ قدوں کے پیش رو تھے، بیوریو کراٹس"

"بس ــــ اور کسی قسم کا کوئی شخص؟"

"ہاں، اُن میں ویسٹرن ریلوے کا چھوٹا سا عملہ بھی تھا۔ جنرل مینجر، چیف انجینئر، چیف پرسنل آفیسر، چیف سیکوریٹی آفیسر، چیف کنٹرولر، چیف کمرشیل سپرینٹنڈنٹ، چیف اکاؤنٹنٹ اور چیف آپریٹنگ سپرینٹنڈنٹ سُکھ دیو"

"سُکھ دیو!"

"ہاں سُکھ دیو، جو اُس وقت وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی غائب تھا اور غائب ہوتے ہوئے بھی موجود تھا۔ وہ اُس وقت ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مول ہِلس کی طرف دیکھ رہا تھا، اور مول ہِلس کی طرف دیکھتے ہوئے ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اُس ایرکنڈیشنڈ ڈبّہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے وہ ابھی ابھی اُتری تھیں۔ بوٹے دار سفید ساری میں ملبوس، کشمیری سیبوں کی طرح تر و تازہ، گلاب کے پھولوں کی سی مہکتی، کھینچی کمان کی سی ابروؤں اور غزالی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے ہوئے۔ اور وہ دیکھ رہا تھا کہ لوہے کے بڑے بڑے ویگنس پر شہر کا کچرا لدا ہے۔ غلاظت اتنی اُبھن چکی ہے کہ تعفّن گہرے سیاہ بادلوں کی طرح فضا پر محیط ہو چکا ہے۔

چیل، کوّے اور گدھ ویگنوں پر منڈلائے چلے جا رہے ہیں۔ مچھروں، مکھیوں اور ہزاروں قسم کے حشرات الارض نے اُن ویگنوں میں اپنا مسکن بنا لیا ہے۔

بھن بھن کی آواز، کوّوں کی کائیں کائیں، چیلوں کی چر ر...
اور گِدھوں کی دھپ سے ویگنوں پر اُترنے کی آواز بھی سُکھ دیو کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

سڑے ہوئے پھل، سڑی ہوئی سبزیاں، سڑے ہوئے مُردار اور سڑا ہوا شہر کا تمام فُضلہ اُن ویگنوں پر لدا ہوا تھا اور سُکھ دیو سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسپیشل یہاں سے گذری اور وہ تعفن براہ راست اُس مہمان رِیکیٹی کے نتھنوں کی راہ پھیپھڑوں میں پہنچا تو کیا ہوگا؟

سُکھ دیو نے جیب سے ایو ڈی کولن لگا رومال نکال کر ناک پر لگایا۔ ڈبہ میں بیٹھے ہوئے تمام مسافروں نے یہی حرکت کی۔ دو ایک نے غیر شعوری طور پر کھڑکیوں پر شیشہ کا چوکھٹا گرا دیا۔ وہ بدبو آج تمام لوگوں سے اپنا خراج وصول کرنا چاہتی تھی۔ وہ جتانا چاہتی تھی کہ میں بدبو ہوں۔ میرا بھی کوئی وجود ہے۔

سُکھ دیو کی گاڑی جب بمبئی سینٹرل اسٹیشن پر تھمی تو وہ بڑی تیزی سے اُس فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے اُترا ___ غیر شعوری طور پر اُس نے اب تک رومال اپنی ناک پر لگائے رکھا تھا ___ اِدھر اُدھر

دیکھ کر جب اُسے یقین ہوگیا کہ آنے جانے والے مسافر حسبِ معمول سانس لے رہے ہیں تو اُس نے ڈرتے جھجکتے اپنی ناک پر سے رومال ہٹایا۔ وہاں کی فضا بدبو سے پاک تھی۔

پھر اُس نے زور زور سے ہوا اپنے پچکے ہوئے پھیپھڑوں میں کھینچی۔ تب کہیں جاکر سُکھ دیو کی جان میں جان آئی ورنہ مہا لکشمی اسٹیشن سے یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ اَدھ موا ہوچکا تھا۔

"سلام ساب۔"

ریلوے کے کسی ملازم کا سلام سُن کر اُسے اپنا عہدہ اور مرتبہ یاد آیا۔ اُس نے گردن ہلا کر سلام کا جواب تو دیا لیکن وہ شخص بڑی دور جا چکا تھا۔

سُکھ دیو کا دماغ دراصل معطل ہوچکا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ صبح کی تر و تازہ ہواؤں کی گئی سیر، ایک گلاس گورنمنٹ کالونی کا خالص دودھ، ایک نیم برشت انڈا، دو مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ، لانڈری میں بڑی نفاست سے PRESS کیا ہوا سوٹ اور گورے گاؤں اسٹیشن پر 'ٹائمز آف انڈیا' پڑھتے ہوئے اپنے جوتوں کو پالش کرانے کا کیف کہاں غائب ہوچکا تھا؟

پس منظر میں اسٹیل کی پٹریوں پر دندناتی ٹرینیں دوڑ رہی تھیں۔ اسٹیشن کی اونچی بہت اونچی چھتیں جو لوہے کی فریموں پر ٹنگی ہوئی تھیں اور اپنے اطراف کا تمام شور یکجا کرکے ایک موٹی اور بے ہنگم گونج کی صورت نیچے پھینک رہی تھیں۔ پلیٹ فارم سے پُل اور پُل سے آفس کی عمارت تک

سُکھ دیو ملیریا کے اُس مریض کی طرح آیا تھا جس کے کانوں میں مچھر کی گنگناہٹ بس کر رہ گئی تھی۔

بڑی میز کے پیچھے پڑی ایک بڑی سی کرسی پر اپنے آپ کو گرانے کے بعد اُس نے اِنٹرکوم پر سکریٹری کو اپنے کیبن میں طلب کیا۔

"وہ اسپیشل کب آ رہی ہے؟"

"ٹین ففٹی (10-50) پر سر۔"

"تمھاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟" سُکھ دیو نے اپنی رِسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"IT IS EXACTLY FIVE PAST TEN SIR"

"اوہ ـــ صرف پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں!"

سُکھ دیو نے اپنے آفس کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔

بیس بیس گز پر تعینات ڈھیلی ڈھالی نیلی وردی والوں کے سیاہ جوتے اور پیٹیوں کے بکلوں سے روشنی کا انعکاس ہو رہا تھا، جوق در جوق آتی ہوئی لمبی چوڑی کاروں کے شیشوں نے بھی چکاچوند پھیلا رکھی تھی۔

"اچھا مین لائین کا ڈاؤن ٹریک پندرہ منٹ کے لیے رُکوا دو، اور اسٹنٹ آپریٹنگ انچارج سے کہو کہ پانچ منٹ میں ایک TROLEY اُس ٹریک پر پہونچا دیں۔ میں URGENTLY مہالکشمی تک جانا چاہتا ہوں۔"

سُکھ دیو کے سکریٹری کا داہنا ہاتھ غیر شعوری طور پر DICTATION لینے کے انداز میں کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنے باس کو اس بیمار موڈ میں

پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آرڈر اوپر سے آیا تھا فوراً تعمیل کی گئی۔

چھٹے منٹ پر سُکھ دیو دو لائن مینوں اور ایک ٹرالی آپریٹر کی سنگت میں مہالکشمی کی اور اُڑا چلا جارہا تھا۔ جوں جوں ٹرالی کلوا کی گاڑی سے قریب ہوتی گئی توں توں سُکھ دیو سے سُکھ دور ہوتا گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اُس نے ٹرالی رُکوادی اور دوڑتا ہوا تین چار ٹریکوں کو عبور کرکے کلوّا کے قریب پہوچا۔

اُس وقت کلوا اپنے ادھ کھلے وین میں لوہے کی سیٹ پر بیٹھا کھانا کھارہا تھا۔ اُس نے ایک سوٹ بوٹ پہنے شخص کو ٹرالی سے اُتر کر جب اپنی طرف آتا دیکھا تو اس کی جان پر آسمان لوٹ پڑا۔

سُکھ دیو نے دس قدم کے فاصلہ ہی سے پُکار کر کہا۔ "میں چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ سُکھ دیو ہوں۔ گاڑی فوراً لوکل ٹریک نمبر سات سے گرانٹ روڈ کی طرف لے جاؤ۔"

"جی صاحب!" کلوّا نے اپنے گلے میں پھنسے ہوئے لقمے کو ہاتھ پھیر پھیر کر نیچے اُتارنا چاہا۔ آلو کے ساگ کے ساتھ پوریاں یا پراٹھے مزہ بھی دیتے ہیں اور حلق سے جلدی اُترتے بھی ہیں۔

آلو کے ساگ کے ساتھ باسی روٹی کا مزہ کلوا ہی کو معلوم۔ لیکن حلق سے اُترنے کی تکلیف دہ کیفیت کا اندازہ کون نہیں کرسکتا تھا؟

اُس نے یہ سوچ کر کہ بھگوان مندر چھوڑ کر اُس کے دوارے چلے آئے ہیں مکمل طور پر اُن کا سواگت کرنا چاہا۔۔۔ ایک پل گنوائے بِنا ہی

اُس نے جھوٹے ہاتھ سے ٹوپی اُٹھا کر سر پر رکھی اور دوسرے ہی لمحے پیٹ تک کھُلے کوٹ کے بٹن لگانے لگا۔

ذہنی کیفیت میں یکایک ہلچل مچ اُٹھنے کی وجہ سے منہ میں پیدا ہونے والا لعاب رُک گیا۔ حلق خشک ہوگیا۔ نوالہ اپنا راستہ چھوڑ کر سانس کی نالی میں داخل ہوگیا۔ کلوا نے جان کنی کے عالم میں اپنے اطراف پانی کی تلاش کی۔ سُکھ دیو سے دس قدم کے فاصلہ پر نلکا لگا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی اُبلی ہوئی سُرخ آنکھوں سے ایک مرتبہ سُکھ دیو کی طرف دیکھا اور پھر نلکے کی طرف۔ قریب تھا کہ وہ چکرا کر لوہے کے BUFFER SPRING پر گر پڑتا۔ سُکھ دیو نے دوڑ کر اسے اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں تھام لیا پھر بڑی مشکل سے GUARD'S VAN کے لوہے کے بنے فرش پر کلوا کو لٹا کر سُکھ دیو نے اپنے ماتحتوں کو آواز دی۔ اِس سے قبل ہی وہ اس کے قریب آچکے تھے۔ سُکھ دیو کے کہنے پر ایک ٹفن کے ڈبہ میں پانی لے آیا، دوسرے نے کلوّا کے سر کو اُس کی کیپ سے تکیہ دیا۔

انھیں لمحوں میں وہ تعفن، وہ بدبو، وہ سڑاندیک بیک سمٹ گئی۔ سُکھ دیو کو اُن ویگنوں پر منڈلاتے چیل کوّوں اور گدھوں سے کوئی گھناؤنا پن محسوس نہیں ہوا۔ بھنبھناتی مکھیوں اور مچھروں اور دیگر حشرات الارض سے اُسے کوئی کراہیت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ تقریباً ۲۵ منٹ کلوا کے سرہانے بیٹھا رہا اور اُس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ کلوا کی طبیعت بحال نہ ہوگئی۔

واپس ہوتے ہوئے اُس نے کلوّا سے کہا۔

"اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے ساب۔۔ وہ پانی ...." کلوا دردمندی سے مُسکرایا۔

"تم اپنا بھوجن ہمیشہ یہیں کرتے ہو؟"

"ہاں صاحب!"

دو لمحے رُکنے کے بعد کلّوا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"شما کر دیجیے گا ساب، اس ڈیوٹی پر چڑھنے سے پہلے اِتنا سمے نہیں مِلتا کہ ناشتہ گھر ہی پر کر سکوں۔"

سُکھ دیو لاکھوں اور کروڑں جرثوموں کو کلوا کے ہر لوالے کے ساتھ اُس کے منہ میں جاتا دیکھ رہا تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ کلوا کا پیٹ بھی مال گاڑی کا ایک ویگن بن چکا ہے جس میں شہر کا بہت سا فضلہ بہت لمبے ہاتھوں نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

"کوئی بات نہیں۔" سُکھ دیو نے کلوا کے شانے تھپکتے ہوئے کہا۔

چار چھ قدم چل کر سُکھ دیو مُڑا۔ جیسے اُسے کچھ یاد آیا ہو۔ یا جیسے اُس نے ابھی ابھی کوئی اہم فیصلہ کر لیا ہو۔

"سنو! ابھی ابھی میں نے تمھیں جو آرڈر دیا تھا نا، اس ٹرین کو لوکل ٹریک نمبر سات پر دور تک لے جانے کا۔"

"جی ساب۔"

"وہ میں وِدڈرا (WITHDRAW) کر رہا ہوں۔"

"جی ساب۔"

دس بج کر پچاس منٹ ہو چکے ہیں۔ وہ اسپیشل آ چکی ہے۔ ٹکہ دیو ریلوے کے عملے کے ساتھ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی غائب ہے۔ غائب ہوتے ہوئے بھی موجود ہے۔

وہ اُس وقت ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مول ہلس (MOLE HILLS) کی طرف دیکھ رہا ہے اور مول ہلس کی طرف دیکھتے ہوئے ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھ رہا ہے۔

وہ اس ایرکنڈیشنڈ ڈبے کی طرف دیکھ رہا ہے جس سے وہ اُتری ہیں۔ کشمیری سیبوں کی طرح تر و تازہ ، گلاب کے پھولوں کی سی مہکتی ——

۱۹۷۶ء

چوراہے پر ٹنگا آدمی

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر ٹخنوں سے۔ گلے میں رسّی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چوراہے پر جھُول رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ٹیری کاٹ کی سفید قمیض اور ٹیری وول کی سلیٹی رنگ کی پتلون غیر شکن آلودہ تھی۔ سیاہ جوتے پر پالش بھی خوب چمک رہا تھا۔ نائلون کے ذرا سے نظر آتے موزوں کا لاسٹک بھی کسا ہوا تھا۔ اس لیے موزے اپنی جگہ پر چُست بیٹھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑا محتاط شخص ہے۔

اُس کے پیچھے کو بندھے داہنے ہاتھ میں اٹیچی لٹک رہی تھی، جو کھُل چکی تھی۔ اس میں بنے خانوں میں ایک بال پین اور ایک پین ٹنکا ہوا تھا۔ دوسرے سے ایک ڈائری کا اوپری سرا جھانک رہا تھا۔

دس بج کر پچاس منٹ ہو چکے ہیں۔ وہ اسپیشل آچکی ہے۔ ٹکہ دیو ریلوے کے عملے کے ساتھ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی غائب ہے۔ غائب ہوتے ہوئے بھی موجود ہے۔

وہ اُس وقت ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مول ہلس (MOLE HILLS) کی طرف دیکھ رہا ہے اور مول ہلس کی طرف دیکھتے ہوئے ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھ رہا ہے۔

وہ اس ایرکنڈیشنڈ ڈبے کی طرف دیکھ رہا ہے جس سے وہ اُتری ہیں۔ کشمیری سیبوں کی طرح تر و تازہ ، گلاب کے پھولوں کی سی مہکتی ——

۱۹۷۶ء

چوراہے پر ٹنگا آدمی

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر ٹخنوں سے۔ گلے میں رسّی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چوراہے پر جھول رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ٹیری کاٹ کی سفید قمیض اور ٹیری وول کی سلیٹی رنگ کی پتلون غیر شکن آلودہ تھی۔ سیاہ جوتے پر پالش بھی خوب چمک رہا تھا۔ نائلون کے ذرا سے نظر آتے موزوں کا لاسٹک بھی کسا ہوا تھا۔ اس لیے موزے اپنی جگہ پر چُست بیٹھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑا محتاط شخص ہے۔

اُس کے پیچھے کو بندھے داہنے ہاتھ میں اٹیچی لٹک رہی تھی، جو کھُل چکی تھی۔ اس میں بنے خانوں میں ایک بال پین اور ایک پین ٹنکا ہوا تھا۔ دوسرے سے ایک ڈائری کا اوپری سرا جھانک رہا تھا۔

جب بحیرۂ عرب کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تھا تو اس کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کو اُڑنے لگتے۔ کھلی ہوئی اٹیچی میں سے کبھی اکا دُکا کاغذ اُڑ پڑتے اور وہ اس رسّی پر ٹنگا ٹنگا اِدھر اُدھر جھول جاتا۔ جھولنے کے عمل کے دوران ہر مرتبہ اس کی سیاہ فریم والی عینک ناک سے ذرا نیچے کھسک آتی اور اب ہر لمحہ کی ٹک پر اس کی ناک سے گر پڑنے والی تھی۔

چرچ گیٹ اسٹیشن کے حلق سے اُگلے ہوئے تمام لوگ اس کے داہنی طرف جمع تھے۔ مرین ڈرائیو کی طرف سے آنے والے اس کے سامنے کی طرف جمع تھے اور اس کی بائیں طرف وہ لوگ جمع تھے جو اِدھر اُدھر کی درمیانی سمتوں سے چلے آئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا لیڈر، کوئی مہاپرش، کوئی مہاتما یا کوئی پیغمبر اُن سے خطاب کرنے والا ہو اور یہ سب کے سب بڑی عقیدت سے اس کا خطبہ سُننے چلے آئے ہوں۔

وہ سب کے سب ایک دوسرے کی صعوبتوں سے واقف تھے۔ اُن سبوں کو معلوم تھا کہ انھیں کپڑے کیوں ڈستے ہیں! جوتے کیوں کاٹتے ہیں! کھانا کیوں بدمزہ لگتا ہے اور پانی کیوں نمکین لگتا ہے!

دلچسپ بات تو یہ تھی کہ اس میں موجود ہر شخص چوراہے پر جھولتے اس شخص کو اپنی شبیہہ سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود چوراہے پر لٹک رہا ہے۔

اسٹیشن کے پورٹیکو کے اوپر نصب گھڑی نے دس بجائے۔

نیلکو (NELCO) کی سکنڈ، منٹ اور گھنٹہ میں وقت بتاتی گھڑی نے دس بجائے۔

یونیورسٹی ٹاور کے کلاک نے دس بجائے۔ اور تمام لوگوں کی رِسٹ واچوں نے دس بجائے۔ لیکن آج جو دس بجے تھے وہ کل کے سے نہیں تھے اور ممکن ہے کہ آئندہ کل کے سے بھی نہ ہوں۔ کیوں کہ ان تمام لوگوں کو اس وقت اپنی اپنی آفسوں میں اپنے اپنے ٹیبلوں کے پیچھے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود ہونا تھا۔ لیکن یہ سب کے سب آج اس چوراہے پر ٹنگے اس آدمی کے گرد جمع تھے۔

سب کے سب خاموش! سب کے سب موشن لیس (MOTION LESS) غیر متحرک! ان کی تو آنکھیں بھی مجسموں کی آنکھوں کی طرح پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور دل! وہ بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

"کچھ کہو ..... کچھ کہو"

وہ سب کے سب یک زبان ہو کر بولے۔

"میں کیا کہوں؟ میں کیا کہوں؟ — میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ ہاتھ پُشت پر بندھے ہیں! اور پیر حرکت کرنے سے معذور! میں تو اِشاروں سے بھی بات نہیں کر سکتا۔ اور نہ یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہوں۔"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ — تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اُن سبوں نے اس چوراہے پر لٹکے آدمی سے پوچھا۔

"تم ہی بتاؤ — تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اُس نے وہی سوال اُن سے کر دیا۔

"ہم کہاں جانا چاہتے ہیں ؟ . . . ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے قہقہہ لگایا — "ہا — ہا — ہا ، جب تمھیں خود ہی نہیں معلوم — اور تم سبوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو ، تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا ؟ اپنے آپ ہی سے پہلے پُوچھ لیتے — !"

"تم مہان ہو !" وہ سب بولے۔

"اِس لیے کہ چوراہے پر لٹک رہا ہوں ؟"

"نہیں — تم وہاں کھڑے ہو جہاں سے ہم سب نظر آرہے ہیں — اور ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

"ہر بلندی سے نیچے کی چیز نظر نہیں آتی۔ اونچائی اتنی ہی ہو کہ جہاں سے سب کچھ نظر آسکے۔"

"تو کیا تم بہت اونچائی پر لٹک رہے ہو ؟" ان سبوں نے کہا۔

"ہاں — !"

"کیا تمھیں ہم نظر نہیں آرہے ہیں ؟"

"مجھے تمھارے سروں کا کالا سمندر نظر آرہا ہے — اور کچھ نہیں!"

"تو کیا تم کچھ نیچے نہیں آسکتے ؟"

چوراہے پر ٹنگے اُس آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہا — ہا — ہا ، تم جانتے ہو کہ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔

میرے دونوں ہاتھ پُشت پر بندھے ہیں۔ میرے پیر بھی حرکت کرنے سے معذور ہیں ـــــ تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی جگہ سے کیسے جُنبش کروں ؟... البتہ تم چاہو تو مجھے نیچے اُتار سکتے ہو۔ تم چاہو تو مجھے کم بلندی پر ٹانگ سکتے ہو۔ اور تم چاہو تو مجھے اور زیادہ بلندی پر بھی اُٹھا سکتے ہو!"

"ہم تمھیں نیچے اُتارنا چاہتے ہیں۔" ان سبھوں نے کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

"ہم تمھیں مناسب اونچائی پر ٹانگنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"ہم تمھیں بہت زیادہ اونچائی پر اُٹھا دینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" چوراہے پر لٹکے ہوئے آدمی نے کہا۔

"یہ کیا بات ہے کہ تم تینوں حالتوں میں رہنے کو تیار ہو۔" اُنھوں نے پوچھا۔

"اِس لیے کہ میں ان تینوں حالتوں میں تم سبھوں سے الگ رہوں گا۔ اس لیے خوش رہوں گا۔ بہت زیادہ اونچائی پر بھی ـــــ کم اونچائی پر بھی ـــــ اور زمین پر بھی۔"

"وہ کیسے ؟ زمین پر تم ہم سے الگ کیسے رہ سکتے ہو ؟"

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے پھر قہقہہ لگایا ـــــ

"ہا ـــ ہا ـــ ہا ، اب میں کبھی صبح اخبار نہیں پڑھوں گا۔ کبھی چائے نہیں پیوں گا ـــ کبھی بوٹ پالش نہیں کروں گا۔ کبھی داڑھی نہیں بناؤں گا ـــ کبھی ریڈیو نہیں سنوں گا ـــ کبھی کام پر نہیں جاؤں گا۔

کبھی راہ چلتے اشتہار نہیں پڑھوں گا ــــ کبھی کسی کو تھینک۔یُو نہیں کہوں گا..... کیوں کہ میں اپنی زندگی کے پہیے کو گھماتے گھماتے۔بور ہوگیا ہوں۔ بے زار ہوگیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ وہ پہیا جس محور پر گھوم رہا ہے وہ اپنی جگہ ہی پر قائم ہے۔ جب محور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا تو پہیا کیوں کر حرکت کرے گا ــــ میں وہیں ہوں جہاں تھا۔ اور اگر محور اب بھی نہ بدلوں تو سالہا سال تک وہیں رہوں گا۔ اس لیے اب محور ہی کوئی اور ہوگا۔ نیا ــــ انوکھا ــــ اچھوتا ــــ!"

دو آدمی دائیں طرف کے درخت پر چڑھ گئے۔ اور دو بائیں طرف کے درخت پر! آناً فاناً اُنھوں نے رسّے کی گرہیں کھولیں اور بڑی آہستگی سے رسہ چھوڑتے ہوئے اس آدمی کو نیچے اُتارا ــــ

اُس آدمی نے زمین پر قدم رکھتے ہی بڑی اجنبیت سے اُس جمِ غفیر کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان تمام کا اس سے جو اجنبی سا رشتہ قائم ہوا تھا ــــ وہ اس کی اجنبی نظروں نے توڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی طرف بڑی گرم جوشی سے بڑھے۔ تاکہ اُسے گلے لگائیں، اور پوچھیں کہ اب اس کا نیا محور کون سا ہوگا؟ کیوں کہ وہ سب کے سب اپنی زندگی کے پہیے کو ایک ہی غیر متحرک محور پر گھماتے گھماتے بور ہوگئے تھے، بے زار ہوگئے تھے ــــ تھک گئے تھے ــــ اور اس نے وہ جو تازگی، فرحت اور کشادگی کی بات کہی تھی، اُنھیں بہت پسند آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے تو اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اُس کے

بیگ کے تمام کاغذات دور دور تک بکھرے پڑے تھے۔ اس نے انھیں، جمع کیا۔ بیگ میں رکھا اور بیگ بند کر دیا۔ جیب سے کنگھی نکالی۔ بال بنائے۔ چشمہ ناک پر درست کیا اور رومال سے منہ صاف کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک سمت کو چل پڑا ___ وہ سب کے سب اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

وہ ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے جا کر رُک گیا۔ عمارت کا داخلی دروازہ مقفّل تھا۔

وہ بڑبڑانے لگا ___ "کیا آج چھٹّی ہے؟"

"کیا آج میں گھر سے جلدی چلا ہوں؟"

"کیا آج کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟"

دوسرے روز حسب معمول اس نے اپنے چائے کے پہلے پیالے کے ساتھ اخبار دیکھا اور یہ خبر پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ کل فلورا فاؤنٹن کے چوراہے پر ایک شخص نے اپنے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی ___ جس کی لاش دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے ___ اور وہ لوگ اس وقت تک جمع تھے جب تک چوراہے پر ٹنگے اس شخص کی لاش نیچے نہیں اُتاری گئی۔

۱۹۷۵ء

دیر دس سال کی

"تم مری داس تو نہیں ؟" اُس نے لالٹین کی لَو اونچی کی اور لالٹین اُس کے چہرے کے قریب لاکر پوچھا۔
"ہاں میں مری داس ہی ہوں۔ لیکن تم نے کیسے پہچانا؟"
وہ اپنی جُھکی ہوئی پیٹھ پر سے نیچے سرکتا ہوا بوجھ سنبھالتا ہوا بولا۔
"میں پچھلے دس سال سے تمھارا منتظر تھا اور ہر رات دو بجے اس اسٹیمر سے آنے والے مسافروں پر نظر رکھتا تھا۔"
"ہاں، میں دس سال سے پہلے آنے والا تھا... لیکن.."
"لیکن کیا... ؟" اُس نے بے چین ہوکر پوچھا۔
"لیکن.... مجھے دیر ہوگئی۔"
"دس سال کی دیر۔" وہ بڑبڑایا۔
"ہاں، دس سال کی۔ میں جس کام سے اُس گاؤں سے نکلا تھا

اُسے پورا ہونے میں وقت لگ گیا۔"

یہ کہہ کر مری داس رُک گیا۔ پھر بولا۔

"کیا ہمیں یہاں سے کورِلم (CORLIM) جانے کے لیے کوئی سواری نہیں ملے گی؟"

"سواری ... نہیں کوئی نہیں۔ دراصل اِس اِسٹیمر سے اِکا دُکا مسافر ہی آتے ہیں اور وہ صبح تک آس پاس کے کِسی جھونپڑے میں قیام کر لیتے ہیں۔"

"ہُوں .... اگر تم سہارا دو تو میں اپنے تھیلے میں سے شراب نکالوں ... اُس کے بغیر تو مجھے چلنا دُوبھر ہوا جا رہا ہے۔"

"ہاں .... سو قدم پر ایک غیر آباد مکان ہے۔ تم چاہو تو ہم دو گھڑی وہیں آرام کر لیں گے۔ کیا تمھارا بوجھ میں اپنے سر لے لوں؟"

"ہاں بہتر ہوگا۔ ویسے یہ اتنا وزنی بھی نہیں لیکن میری صحت اب اسے بھی گوارہ نہیں کر رہی ہے۔"

اُس نے اپنا سر جُھکا کر مری داس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیا اور راستہ چلنے لگا۔

"اِس میں تم کیا لائے ہو؟"

مری داس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ "بہت سا سامان ہے۔ مالتی کے لیے ساڑیاں، دھن راج کے لیے سوٹ کا کپڑا۔ شانتا رام کے لیے نیکریں اور قمیص اور رادھا کے لیے فراکیں۔"

رات کی گہری تاریکی میں سڑک سنسان پڑی تھی۔ آسمان پر صرف

ایک ستارا کبھی چمکتا اور کبھی بجھتا نظر آتا تھا اور اُن کے دائیں بائیں اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں سے کبھی جھینگروں کی پُراسرار سیٹیاں اور کبھی لومڑیوں کے رونے کی دردناک صدائیں سُنائی دے جاتی تھیں۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ کیا تمھیں میری لائی ہوئی چیزیں پسند نہیں آئیں۔ ارے، میں اپنے ساتھ بہت ساری مٹھائی بھی لایا ہوں۔ ایک ٹرانزسٹر لایا ہوں۔ ایک ٹیپ ریکارڈر لایا ہوں۔ اور گوری گوری میموں کے ننگے فوٹو بھی لایا ہوں۔ وہ صرف اپنے دوستوں کو دِکھاؤں گا۔ ٹرانزسٹر بستی کے تمام لوگ سُن سکتے ہیں اور ٹیپ ریکارڈر پر میں سبھوں کی آواز قید کر کے اُنھیں حیرت میں ڈال دوں گا۔"

سڑک پر اُن کے قدموں کی آواز دَمکتی رہی۔ ایک چمگادڑ دائیں طرف کے درخت سے اُڑی اور بائیں طرف کے درخت پر جا بیٹھی۔

"ٹھیک ہے مجھے تمھاری لائی ہوئی چیزوں کی پسند اور ناپسند سے کیا واسطہ؟ چیزیں تمھاری ہیں اور تم انھیں اپنے لوگوں کے لیے لائے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ....؟"

"تم خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ کہتے کیوں نہیں؟"

وہ جواب دینے سے پہلے بڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"وہ رہا مکان۔ تم ذرا دم لے لو۔ پھر بتاؤں گا۔"

وہ اُس ویران مکان کے چبوترے پر چڑھ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں اُنھوں نے مکان کے ورانڈے کا ایک گوشہ منتخب کیا۔ اُس نے اپنا بوجھ بہ آہستگی سر سے اُتارا۔ مری داس نے بڑھ کر تھیلا

کھولا۔ اُس میں سے ٹٹول کر ایک سیاہ بوتل نکالی۔ پھر ٹٹول کر پلاسٹک کے دو ٹمبلر (TUMBLER) نکالے، ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنی گود میں رکھ لیا۔ پٹخ کی آواز ہوئی اور بوتل میں بھری ہوئی شراب کی تیز بو ہوا میں منتشر ہوگئی۔

بُڑ... بُڑ... کی آواز کے ساتھ اُس نے شراب دونوں ٹمبلروں میں اُنڈیلی۔ سگریٹ سلگائی اور اطمینان سے اپنے ساتھی کے برابر دیوار سے ٹیک لگاکر بیٹھ گیا اور اپنے پیر پھیلا دیے۔

"ہاں تو تم کیا کہنے جا رہے تھے؟" مری داس نے پوچھا۔ اس کی آواز شراب کے زیر اثر واضح ہوگئی تھی اور لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔

"نہیں پہلے تم بتاؤ۔" اُس کے ساتھی نے اصرار کیا "تمھاری وہاں کیسے گذری؟"

مری داس گویا ہوا:

"تم جانتے ہو کہ میں یہاں مانڈوی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ پرتگالیوں کا زمانہ تھا۔ ہر چیز سستی تھی۔ چاول چار آنے کا سیر بھر اور مچھلی دو آنے کی پاؤ سیر، فینی ایک آنہ پیگ اور سوڈا آدھ آنے کا۔ غرضکہ سو روپے کی تنخواہ میں میرا، میری بیوی کا اور تینوں بچوں کا اچھا گذرہ ہو جاتا تھا۔

لیکن..." وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر اُس نے اپنے ساتھی کو اپنے ہاتھ سے چھُو کر، پھر آنکھوں سے بغور دیکھ کر محسوس کیا اور یہ یقین کر کے کہ وہ اُس کے بچپن کا یار ہے، کہنے لگا۔

"۱۹۶۱ء میں گوا آزاد ہوا۔ ہمارا راج ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز مہنگی ہوگئی۔ لوگوں نے دوسری ریاستوں سے یہاں آنا شروع کیا۔ کاروبار شروع کیا۔ یہاں کی سستی چیزیں وہاں لے گئے اور وہاں کی چیزیں مہنگے داموں ہمیں بیچنے لگے تو پھر ہمارا جینا دشوار ہوا۔ سو روپے تو انتہائی ضروری کھانے، پکانے، پینے، اوڑھنے کی چیزوں کے لیے ناکافی ہونے لگے۔ اور کچھ نہ بن پڑا تو میں نے ایک انگریز سیاح سے جو کہ میرے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، رائے لی کہ اگر میں یورپ کی کسی ہوٹل میں ملازم ہوگیا تو مجھے کیا تنخواہ ملے گی؟ جانتے ہو اُس نے مجھے کیا بتایا؟"

"نہیں۔"

"دس پاؤنڈ ہفتہ وار۔ یعنی دو سو روپے ہفتہ وار تنخواہ یعنی آٹھ سو روپے ماہانہ۔ میں نے فوراً اپنا پاسپورٹ بنوایا۔ ویزا کے لیے عرضی دی۔ دو ہفتے میں مجھے یورپ جانے کی اجازت مل گئی اور ایک رات میں اسی دو بجے آنے والے اسٹیمر سے یہاں سے رخصت ہوا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے تمھیں وداع کرنے تمھاری بیوی، تمھاری بیٹی اور دونوں بیٹے بھی یہاں آئے تھے۔ گاؤں کے آٹھ دس لوگ بھی اُن کے ساتھ تھے۔"

"ہاں یار .... وہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے گاؤں کوریم کا کوئی شخص سمندر پار جا رہا تھا۔"

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں کے سامنے تیرہ سال پہلے کی رات کا وہ منظر گھُوم گیا۔ کتنے بجھے ہوئے دل سے کتنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روکے اور کتنے بھاری قدموں سے وہ اسٹیمر کی ڈولتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ اُس کی بیوی میلی کچیلی ساڑی میں ملبوس، اپنے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی اور اُس کی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ البتہ اُس کے دونوں شرارتی لڑکے دِل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اُن کا سخت دل باپ لمبے عرصے کے لیے دوسرے ملک جا رہا ہے۔

پھر اسٹیمر کی ہوٹ نے اُس کا کلیجہ دہلا دیا۔ وہ انجانے ملک میں انجانے لوگوں کے درمیان رہنے کے تصوّر ہی سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ اور اُس تنہائی کے خوف اور اپنی بے چارگی و کسمپرسی کے ڈر کے تحت اُس نے چاہا کہ لپک کر کنارے پر کود جائے اور اپنی بیوی و بچّوں کو گلے لگا کر کہے کہ کیا تم ایک وقت کا فاقہ نہیں کر سکتے کیا موٹا جھوٹا نہیں پہن سکتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ تمھارا پتی اور تمھارا باپ تم سے ہزاروں میل دور محض اس لیے چلا جائے کہ وہ تمھیں سونے کا نوالہ اور اطلس کا لباس پہنا سکے۔ کیا تم اس کی رفاقت اور اُس کی سرپرستی میں خوش نہیں ہو؟

لیکن اسٹیمر کنارا چھوڑ چکا تھا اور وہ اپنے عزیزوں کو جیٹی (JETTY) پر ننگے بلبوں کی زرد روشنی میں اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بڑی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔

"تم دس سال پہلے آنے والے تھے..." اُس کے ساتھی نے

اپنی بھرّائی ہوئی نشہ آلود آواز میں اپنا سوال دہرایا۔
" ہاں دس سال پہلے آنے والا تھا۔ لیکن مجھے دیر ہو گئی۔"
اُس نے بھی اپنا جواب دہرایا۔
" دس سال کی دیر ؟ " اُس کے ساتھی نے پھر حیرت واستعجاب سے پوچھا۔
" ہاں دس سال۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ دیر منٹ، گھنٹہ، دن، ہفتہ اور مہینہ کی ہو۔ سال بھر کی ہو سکتی ہے اور دس سال کی بھی ہو سکتی ہے۔"
اُس نے شراب کا آخری قطرہ بھی اپنے گلاس میں اُنڈیل لیا وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کی پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں اور وہ باوجود کوشش کے انھیں پل دو پل کھُلی نہیں رکھ پا رہا ہے اور اُسے اس کا پتہ نہیں تھا کہ اُس کے ذہن کے پچھلے کواڑ کھُل چکے ہیں جن کے راستے یادوں کی برات بڑھی چلی آ رہی ہے۔
" تین سال لزبن (LISBON) میں کیا کماتا ؟ اوں . . . . وہاں تو ہر چیز بہت مہنگی تھی۔ بہت مہنگی۔ بیر تین شلنگ کی ایک پاینٹ (PINT) وہسکی دس شلنگ کی اور . . . اور کھانا۔ یار تیرے ہاں آج کیا پکا ہے ؟"
" اوگڑا رائیس (RICE) اور ویلری (VELRY) مچھلی کا سالن۔"
" اُوف ! " وہ اپنی اُنگلیاں چاٹنے لگا۔ تیرہ سال بیت گئے

تھے اور اس نے اُبلا ہوا بھات اور مچھلی کا چٹپٹا سالن نہیں کھایا تھا۔

"پھر میں لزبن سے لندن گیا۔ لندن سے پیرس۔ پیرس سے ہانگ کانگ اور وہاں سے سیدھا سنگاپور۔ ایک بات بتاؤں یار . . . میری زندگی وہاں بڑی غیر مطمئن اور بڑی غیر محفوظ سی گذری۔"

"ہزار بارہ سو کی نوکری ہوتے ہوئے تم یہ کیونکر کہہ سکتے ہو؟"

"یہی بات تو تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی! یہاں ہماری نظر میں روپے پیسے کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن وہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہاں کام بہت ہے۔ کام کرنے والے نہیں۔ اس لیے ہزار بارہ سو کی نوکری تو ہر کس و ناکس کو مِل جاتی ہے لیکن بحیثیت ایک انسان کے میری کوئی عزّت نہیں تھی وہاں۔ کوئی قدر نہیں تھی وہاں۔ میں مشین کے کسی کل پُرزے کی طرح کام کرتا تھا۔ بغیر کسی جذبے کے، بغیر کسی احساس کے، بغیر کسی شوق کے۔ یہاں تو میں کبھی کیرمل کسٹرڈ (CARAMEL CUSTARD) تیار کر دیتا اور وہ کسی گاہک کو پسند آجاتا تو ویٹر آکر مجھے شاباشی دیتا۔ میرا دل بڑھاتا۔ مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ گاہک نے ویٹر کو جو روپیہ بطور ٹِپ دیا ہے اُس میں میرا بھی حصّہ نکلتا ہے۔ وہاں ٹِپ ملتی تھی لیکن دِل کو بڑھاوا نہیں مِلتا تھا۔ وہاں تو ایک قاعدہ تھا تمام (TIPS) ایک ڈبےّ میں جمع کر دی جاتی تھی۔ ہر ہفتہ ہر چھوٹے بڑے کو اُس کا حصّہ مِل جاتا تھا۔ جو میری ہفتہ بھر کی تنخواہ سے زیادہ ہوتا تھا۔"

"کیا کہا، ہفتہ بھر کی تنخواہ سے زیادہ ہوتا تھا۔"

"ہاں!"

"اُس کے باوجود تم وہاں خوش نہیں تھے؟"

"ہاں!"

"کیا بکتے ہو؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"چاہے تم جو سمجھو۔ لیکن میں ہوش میں ہوں اور سچ کہہ رہا ہوں۔ وہاں جاکر ہی مجھے محسوس ہوا کہ روپیہ پیسہ اتنا اہم نہیں جتنا اہم ہمارا وجود ہے۔ اپنا آپ ہے۔ اپنی انا ہے۔ اور یہ وہ چیزیں بھی نہیں جنھیں داموں خریدا جا سکے۔ تمھیں اِس دُنیا میں ایسے لوگ مِل جائیں گے جو اپنا سب کچھ بیچ دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن میں اُن میں سے نہیں۔ لیکن یہ وہ بات مجھے اپنے وطن، اپنی بیوی، اپنے بچوّں، اپنے دوستوں، اپنے عزیزوں سے ہزاروں میل دُور جاکر معلوم پڑی۔"

"تو پھر تم فوراً واپس ہو جاتے، تمھیں وہاں تیرہ سال تک رُکنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے تو اپنی بیوی کو دس سال پہلے لکھا تھا کہ تم جولائی کی ۲۸ر تک واپس ہو رہے ہو؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، مجھے فوراً لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن یہ سوچ کر وہاں رُک گیا کہ میرے آنے جانے پر پانچ ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ یہ روپے میں نے بڑی کٹ کسر سے جمع کیے تھے اور یہ بچت میں سالہا سال سے کرتا چلا آیا تھا۔ اس لیے اتنی رقم میں وہیں رُک کر جمع کر لینا چاہتا تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پانچ ہزار کے لیے تیرہ سال تک بکتے رہے ؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ تیرہ سال تک پانچ ہزار کے لیے نہیں بلکہ ایک سال تک اُن پانچ ہزار روپیوں کے لیے بہ سبب مجبوری بکا۔ اور بارہ سال تک ساٹھ ہزار کے لیے اپنے شوق سے بکا۔"

"کیا کہہ رہے ہو ؟ کیا تم ساٹھ ہزار کے آسامی بن گئے ہو ؟"

"بڑا غلط لفظ استعمال کیا ہے تم نے۔ جس شخص کے پاس ساٹھ ہزار ہوں اُسے آسامی نہیں کہتے، آسامی ساٹھ لاکھ اور ساٹھ کروڑ کے مالک کو کہتے ہیں۔ ان ساٹھ ہزار سے میں کون سے ہوٹل اور ریسٹورانٹس تعمیر کر لوں گا۔ یہ تو میرے بال بچّوں کی پرورش، اُن کی پڑھائی لکھائی پر صَرف ہو جانے والے ہیں۔ میرے اور میری بیوی کے بڑھاپے اور بیماریوں کے علاج معالجے پر خرچ ہو جانے والے ہیں۔ اور تم محسوس کر رہے ہو گے کہ اب میرے جسم میں، میرے دماغ میں اور میرے دل میں بیچنے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا۔"

سینٹ فرانسس زیویئر چرچ کی بالائی منزل پر نصب دس من وزنی پیتل کا گھنٹہ بجا۔ ٹن... ٹن... ٹن... ٹن...

پھر دُور بہت دُور کوئی مرغ اذان دینے لگا۔ ککڑوں کوں .... ککڑوں کوں ....

"لو باتوں باتوں میں صبح ہو گئی۔ چلو اب گھر چلیں۔"

اُس کے ساتھی نے تھیلا باندھا اور سر پر اُٹھالیا۔ ایک ہاتھ سے بجھی ہوئی قندیل اُٹھائی اور دوسرے سے مری داس کو سہارا دیا۔ اُون کے نیلے اوور کوٹ میں ملبوس مری داس لڑکھڑا کر اُٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلنے لگا۔

کچھ دور چل کر وہ اچانک رُک گیا۔ پھر اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اپنے ساتھی کو بغور دیکھا۔ پھر اپنے سفید بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چلنے لگا۔ پھر رُک گیا اور بولا۔

"تم کیتان فرنانڈیس (CAITAN FERNANDES) ہی ہونا؟"

"ہاں کیوں۔ تمھیں تعجب کس بات کا ہے؟"

"اور میں مری داس ہی ہوں نا؟"

"ہاں، میں نے تمھیں اندھیرے میں بڑی مشکل سے پہچانا تھا۔"

"لیکن تمھاری اور میری عمر میں اتنا تضاد کیوں نظر آرہا ہے؟"

"تضاد، کیسا تضاد؟"

"میں بہت بوڑھا، بہت کمزور اور تم اتنے جوان ہٹے کٹے۔"

"شاید اُس کی ایک ہی وجہ ہے؟"

"کیا ہے؟ کیا ہے؟ کیا ہے وہ وجہ؟"

بے چین ہو کر مری داس نے اُس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑ دیے۔

"یہی کہ میں نے یہاں کچھ نہیں بیچا۔"

سنہ ۱۹۷۶ء

سیڑھیاں

کال بیل بجا کر میں نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی۔ کلف لگے ہوئے ادھڑے کالر کے پچھلے حصّے سے باہر جھانکتے ہوئے دھاگوں کو اندر دبایا۔ ایک نظر جوتے پر ڈالی جو پچھلے ساڑھے تین سال کی لگاتار خدمت کے بعد اب مجھے منہ چڑانے کی جسارت کرنے لگا تھا ـــــــ

مسز بسین کے چہرے پر ناخوشگوار آثار تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے شاید انھوں نے مجھے دروازہ کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔

"نمستے!" میں نے اٹیچی کیس سمیت دونوں ہتھیلیاں جوڑیں ـــ

اس کے باوجود اُن کے لبوں کو مُسکرانا یاد نہ آیا۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح وہ اپنی جگہ پر گھومیں اور مجھے غلام گردش میں بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ کی چوکھٹ ایک دھماکہ سے لرزی اور اپنے چہرے کو میں نے زیادہ بشاش بنا لیا۔

گندمی رنگ اور کھڑے ناک نقش کے پینتالیس سالہ مسٹر بسین صوفہ کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے ٹائم میگزین پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے فلیٹ کی آرائش دیکھ کر میں اپنے آپ کو بڑا کم تر سمجھ رہا تھا۔ اُن کے قدم کے آگے اپنے کو بالشتیہ سمجھنے لگا۔ اُنھوں نے گرم جوشی سے ہاتھ مِلایا۔

" ششی صاحب، میں نے آپ کو آج اِس لیے بُلایا تھا کہ ....."

صوفہ بڑا آرام دہ تھا۔ پنکھے کی ہوا جسم کو بادِ سحری کی طرح چھُو رہی تھی۔

"..... میں اپنا اور اپنی بیوی کا ....."

دیوار پر ٹنگی پینٹنگ پر مٹیالے رنگ سے تین جھونپڑے ایک قطار میں بنائے گئے تھے۔ ایک کے در پر ایک عورت بیٹھی چولھا سُلگا رہی تھی۔ چار چُوزے اُس کے قریب ہی دانے چُگ رہے تھے۔ عقب میں ایک سیاہ فام آدمی لنگوٹی باندھے، کاندھے پر ہَل رکھے گھر لوٹ رہا تھا۔

"..... جوائنٹ انشورنس کرانا چاہتا ہوں۔"

میں سب کچھ بھُول گیا۔ مسٹر بسین کی زبانی میں سب کچھ سُننے کا متوقع تھا لیکن یہ سُننے کو واہمہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اپنے خوشی سے اُڑتے ہوئے حواس قابو میں کیے۔

خادم ایک کشتی میں نارنگی کے رس کے دو گلاس لے آیا، اور ٹی پائی پر رکھ گیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر ایک گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ نارنگی کا عرق میرے کلیجے کو ٹھنڈک پہونچاتا، دل و دماغ کو آسودگی بخشنے لگا۔

" کل میرے ہم عمر دوست کا انتقال ہو گیا۔"

اُن کی آنکھیں سُکڑ گئیں اور ان میں رنج و غم کی نمی دکھائی دینے لگی۔

"آپ نے اس سے قبل کئی مرتبہ کوشش کی پر مجھے انشورنس کرانے پر آمادہ نہ کر سکے۔"

نو مرتبہ میں کسی کے مکان پر نہیں گیا تھا۔ اپنے دوست کے یہاں بھی نہیں۔ لیکن 'دیو دوت بلڈنگ' کے اِس فلیٹ پر میری زندگی کا یہ واحد اصول بھی ٹوٹ چکا تھا۔

وہ جملے مجھے یاد ہیں۔

"ڈیڑھ ہزار میری تنخواہ، دو ہزار کی میری بیوی کی پریکٹس کُل دو ہزار کا ہمارا خرچ۔ ششی صاحب ڈیڑھ ہزار ہماری ماہانہ بچت ہے۔ انشورنس کراکر کیا فائدہ!"

مغربی جانب کی دونوں وسیع و عریض کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سمندر کی ہموار سطح پر موجیں دبا دبا جوش لیے بار بار اُٹھ کر معدوم ہوجاتی تھیں۔

ڈیڑھ لاکھ کی بیس سالہ پالیسی کا سالانہ پریمیم کتنا ہوگا؟"

فاؤنٹن پین قمیض کے بٹن کے سوراخ سے نِکل کر اتنی بڑی رقم کا حساب کرنے سے جھجکنے لگا۔

"ساڑھے سات ہزار صاحب۔" کتنا وقت لگا حساب کرنے میں مجھے۔ کانپتے ہاتھ، بے قابو ذہن، پینڈولم کی طرح کمیشن کی لمبی ڈور پر جھولنے والا دِل رکھنے والا شخص کیوں کر حساب جلدی سے کر سکے گا۔

"آرتی۔" مسٹر بسین کی آواز کی بازگشت سنائی دی اور مجھے فلپس کمپنی کے اسٹیریو ساؤنڈ والے ریکارڈ پلیر کی قیمت یاد آئی۔ ۸۹۹ روپئے۔

میاں بیوی کا طبی معائنہ ہو چکا۔ انشورنس کی کاغذی کاروائی بھی ہو چکی۔

بچوں کے سو جانے کے بعد میں اُس رات اپنی بیوی کے ساتھ بڑی دھیمی آواز میں اپنے ۲۵ فیصدی کمیشن کی ڈھائی ہزار روپے کی رقم سے سپنے بننے لگا۔

باتیں خوش آیند ہوں تو نیند جلدی آتی ہے۔ میری بیوی لبوں پر مسکراہٹ لیے سو گئی۔ اور میں حسب معمول دریچے سے رات کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ چھنتی ہوئی چاندنی میں اپنی بیوی اور بچوں کے کمزور اجسام اور اپنے تنگ کمرے کے پرانے ساز و سامان کو اُن ڈھائی ہزار روپے کے غیر مرئی ہاتھوں سے سنورتے دیکھتا رہا۔

صبح سویرے نہا دھو کر میں نے پھر وہی کلف لگا جوڑا پہنا۔ جوتے پر برش پھیرا۔ ناشتہ کیا۔ سبق یاد کرتی ہوئی بچیوں کے گال سہلائے اور بیوی کو پرنام کر کے مسٹر بسین کے مکان کو چلا۔

نصف درجن مرغابیاں سمندر کے کنارے پڑے ہوئے سیاہ پتھروں پر بیٹھیں مچھلیوں کے کنارے پر بہہ آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ مشرقی ٹیلے پر اونچی نیچی عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا جس کے پیچھے سے سینٹ میری چرچ کے مینار نظر آرہے تھے۔ سمندر اور ٹیلے کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک پر میں چل رہا تھا، اور اکا دُکا لوگ بھی۔ بینڈ اسٹینڈ اُس وقت گویا کے کسی دُور افتادہ جزیرہ کی طرح نظر آرہا تھا۔

چودہ منزلہ "دیو دت" کے نیپالی چوکیدار نے میرا استقبال کیا۔

"شاب لفٹ خراب ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور اپنی آنکھیں لکیروں میں بدل دیں۔

میں نے گردن ہلائی اور آگے بڑھ گیا۔

بیس مینٹ پارکینگ میں مسٹر بسین کی گہری نیلی امبیسیڈر کار دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ گھر ہی پر ہیں۔ نو منزلوں کی ایک سو اسّی سیڑھیاں میں آٹھ منٹ میں پھلانگ گیا۔ اُن کے فلیٹ کی کال بیل بجائی۔ مسز بسین نے دروازہ کھولا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

"آیئے ششی صاحب، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے نو منزلے چڑھنے کی زحمت نہ کریں گے۔"

"نو منزلے ......"

یہ کہتے کہتے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دَم کتنا پھول گیا ہے۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ نو منزلے تو کیا میں اُن ڈھائی ہزار روپیوں کے لیے ننانوے منزلے بھی چڑھ سکتا ہوں۔

مسٹر بسین اپنا سر پونچھتے، ریشم کا گون پہنے باتھ روم سے ڈرائنگ روم میں آئے۔ ان کے جسم سے بڑی بھینی بھینی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ شاید ٹیلکم پاؤڈر کی، شاید آفٹر شیو لوشن کی، شاید صابن کی۔

میں نے سوچا آفٹر شیو لوشن کی وہ شیشی کتنے کی ہوگی جس پر ایک بادبانی کشتی کی تصویر بنی ہے۔

"سوری مسٹر ششی آج ذرا دیر میں آنکھ کھُلی۔

وہ اُسی کرسی پر بیٹھ گئے، جس پر وہ کل بیٹھے تھے۔

"کوئی بات نہیں صاحب، یہ نیند ہر کسی کو نصیب نہیں۔ خوش قسمتوں ہی کو آتی ہے۔"

میں انھیں مہینوں نیند سے عاری آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ مجھے اِنسومنیا (INSOMNIA) کی شکایت ہے لیکن نہ کہہ سکا۔

نوکر کشتی میں پھر نارنگی کا شربت لے آیا۔ اس کے پیچھے مسز بسین چلی آئیں۔ اُن کے ایک ہاتھ میں چیک بُک اور دوسرے میں سنہرے کیپ کا فاؤنٹن پین تھا۔ شاید پارکر ہو۔

وہ میرے بازو میں آکر بیٹھ گئیں اور ٹِپائی اپنے قریب سرکا کر چیک لِکھنے لگیں۔

"ٹُو لائف انشورنس کارپوریشن آف اِنڈیا،

رُوپیز سیون تھاؤزنڈ اینڈ فایو ہنڈرڈ اونلی، /-Rs.7500"

اس کے نیچے انھوں نے دستخط کر دیے۔ چیک کراس کر دیا اور چیک بُک میں سے پھاڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اظہار تشکّر سے بھیک لینے کے انداز میں اُسے دونوں ہاتھوں سے قبول کیا اور اُسے اٹیچی کیس میں بڑی احتیاط سے اپنی ڈائری میں رکھ دیا۔

اس دوران میں مسٹر بسین کپڑے تبدیل کر چکے تھے، اور آفس جانے کو تیار تھے۔ انھوں نے نارنگی کے شربت کا گلاس اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "تھینکس" کہہ کر میں نے اُسے لبوں سے لگا لیا۔ اور غٹا غٹ پی گیا۔

مسز بسین اپنی لانبی اُنگلیوں کے ناخنوں کی سُرخی کو بغور دیکھتی ہوئی بولیں۔ "ششتی صاحب آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں..."

"جی فرمایئے۔" میں نے بڑی سعادت مندی سے سر جُھکا دیا۔

"مجھے پتہ ہے کہ آپ کو ان ساڑھے سات ہزار روپیوں میں سے ڈھائی ہزار روپے کمیشن ملے گا۔"

"جی... جی ہاں...." میں ایک کچھوے کی طرح خول میں سمٹنے لگا۔

"اور اس کے بعد ہماری ہر قسط پر پانچ فیصدی..."

"جی... درست ہے... بالکل صحیح..." میں اپنے خول سے منہ باہر نکالے بغیر بولا۔

"تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنا کمیشن بطور ڈسکاؤنٹ (DISCOUNT) ہمیں دے دیں۔"

کسی نے جیسے میرے خول کے دہانے پر پتھّر کی سِل رکھ دی۔ میں اُس گنبد میں چیخا۔

"جی... جی... یہ کیسے ہو سکتا ہے..."

مجھے اپنی آواز کی بازگشت سُنائی دی۔

ڈھائی ہزار کی رقم تو آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں تو ان روپیوں سے اپنی دُنیا سنوار سکتا ہوں۔ اپنی بیوی کے لیے وٹامن کے انجکشن، بچّوں کے لیے دودھ، اپنے لیے قمیض۔ جوتا۔!

ایک چھوٹا سا ریڈیو اور پنکھا۔!

مسٹر بسین جو اب تک خاموش تھے، بولے۔

"مسٹر ششی، ٹرائے ٹو بی ریزنیبل (TRY TO BE REASONABLE) آپ کو تو دوسرے کلائنٹس (CLIENTS) سے بھی کمیشن مل جاتا ہوگا۔"

میں تقریباً روہانسا ہو کر بولا۔

"ہاں صاحب ہر ماہ ساڑھے چار سو روپے۔"

تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا گذر بسر تو ہو ہی جاتا ہوگا۔ آپ مہربانی فرماکر اپنا یہ کمیشن ہمیں دے دیں۔"

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" میں صوفہ سے اُٹھتا ہوا بولا۔

"کمیشن ملتے ہی میں آپ کو لوٹا دوں گا۔"

"شکریہ ششی صاحب۔" مسز بسین مجھے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سُنائی نہ دی۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

سنہ ۱۹۷۶ء

کیلاش پربت

کیوب ازم کے نمونے پر بنی یہ پندرہ منزلہ عمارت جو آپ دیکھ رہے ہیں، کیلاش چند جی کی ملکیت ہے۔ اس کے پہلے منزلہ پر خود کیلاش چند جی رہتے ہیں۔ دوسرے پر ان کا بڑا لڑکا اویناش، تیسرے پر اُن کا چھوٹا لڑکا دینیش اور چوتھے پر اُن کی لڑکی مادھوری، پانچواں منزلہ کیلاش چند جی نے اپنی دھرم پتنی آشا دیوی کے بھائی کے سُپرد کر رکھا ہے۔ چھٹا منزلہ بھی آشا دیوی کے کسی رشتہ دار کی تحویل میں ہے۔

جس طرح ہر منزلہ کی تعمیر میں اینٹ، چونا، گارا اور اسٹیل کا استعمال ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح اِس خاندان کی اُٹھان میں محنت، ریاضت، تپ اور فکر کار فرما رہی ہے۔ جس طرح عمارت کی ہر منزل ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہوئے بھی فرش اور چھت سے مُلحق ہے۔ اُسی طرح عمارت کی ہر منزل پر رہنے والی فیملی ایک دوسرے سے

جدا ہوتے ہوئے بھی فرش اور چھت سے ملحق ہے۔ اسی طرح عمارت کی ہر منزل پر رہنے والی فیملی ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود بزنس کے مفاد اور کیلاش چندجی کی پالیسی سے بلا واسطہ جڑی ہوئی ہے۔

عمارت کی ساتویں آٹھویں منزل پر کوئی نہیں رہتا۔ نویں دسویں پر بھی نہیں۔ گیارہویں بارہویں پر بھی نہیں اور تیرھویں چودھویں پر بھی نہیں۔

لیکن پندرھویں منزل پر ؟

ہاں ، کوئی رہتا ہے۔

کون ؟

یہ میں ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ لیکن .... ذرا ٹھہریے۔

عمارت کی ساتویں آٹھویں منزلیں کیوں خالی ہیں ؟

پہلے اس سوال کا جواب دے دوں۔

کیلاش چندجی کے سورگ واشی دادا سیٹھ کلیان جی اودے پور کے مہاراجہ گیان چندجی کے دیوان تھے۔ اُن کی بڑی زمینیں ، کوٹھیاں اور حویلیاں تھیں۔ بات کیا تھی ؟ واقعہ کون سا پیش آیا تھا کہ مہاراجہ گیان چندجی نے اپنے معتبر دیوان کو شاہی دربار سے الگ کر دیا ؟ لیکن راجپوتوں میں ایک صفت ہے جو آج کل کے لحاظ سے عیب بن چکی ہے ، اُن کی دی ہوئی زبان ! وہ جسے زبان دیتے ہیں اُس سے کبھی نہیں پھرتے۔ کلیان چندجی شاہی دربار سے ضرور الگ کر دیے گئے ، لیکن اُن کی جائیداد ، اُن کی زمین اور اُن کا سرمایہ اُن سے نہیں چھینا گیا۔

کلیان چند جی نے تمام جائیداد کے پیسے کھرے کیے اور اپنے رشتہ داروں کو لے کر شمال کی طرف کوچ کر گئے۔

بات طول پکڑتی جا رہی ہے اور آپ اُس پندرہویں منزل کے مکین کے بارے میں جاننے کو بے قرار ہوئے جا رہے ہیں۔ تھوڑا صبر اور کیجیے۔ میں ابھی آپ کی تشویش دور کیے دیتا ہوں۔

شہر لدھیانہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد کلیان جی نے اُون کا کاروبار سنبھالا۔ اُن کی ذاتی نگرانی میں کاروبار خوب پھلا پھولا۔ انھوں نے مزدوروں کو عام کرخنداروں سے زیادہ اُجرت دی۔ اُن کے سُکھ دُکھ میں شریک ہوئے۔ اُن پر نگرانی کرنے والوں کو ہمیشہ تاکید کی کہ وہ اپنے ماتحتوں سے جبر سے کام نہ لیں۔ اُن پر کسی قسم کی سختی نہ برتیں۔ کلیان چند جی کی یہ پالیسی بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ مزدور دِن رات محنت مشقت کرتے رہے اور لگن سے کام کرتے رہے۔ نتیجہ کلیان چند جی کے سامنے چند سالوں ہی میں برآمد ہوا۔ اُن کا مال ہندوستان کے کونے کونے میں تو کھپا ہی، عرب، ملایا، انڈونیشیا کے بازاروں میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اِن ایشیائی ملکوں کے دورے پر تو انھیں جانا ہی پڑتا تھا، پر وہ کبھی کبھار مغربی ملکوں کے بازاروں میں بھی گھوم آتے تھے۔ چونکہ شاہی دربار سے متعلق رہ چکے تھے اس لیے شاہی مزاج اُن کی شخصیت کا ایک عنصر بن چکا تھا۔ وہ جس ملک کے دورے سے واپس ہوتے، بطور یادگار چند چیزیں اپنے ساتھ ضرور لیتے آتے۔ عمارت کی ساتویں اور آٹھویں منزل پر وہی چیزیں محفوظ کر دی گئی تھیں۔

دستی گھڑیوں سے لے کر قدِ آدم کے برابر کلاکس (CLOCKS)، ہاتھی
دانت کے بنے پائپ سے لے کر سہ رنگی آبنوس کے پائپ، ماچس کی
ڈبیہ جتنے فانوس سے لے کر لال قلعہ کے سب سے بڑے فانوس کے
برابر کے فانوس، سینکڑوں قسم کے جوتے، واکنگ اسٹیکس (WALKING
STICKS) بے شمار رنگین پتھر، بیسیوں قسم کی تلواریں، سینکڑوں
طرز کے خنجر، بے مثال پینٹنگس، لاجواب دستکاری کے نمونے اور کئی
مخطوطے، اُن میں شامل تھے۔

چند منٹ اور۔ پھر میں آپ کو بتادوں گا کہ پندرہویں منزل
پر کون مقیم ہے؟ یقین جانیے کہ آپ کو اُس کے متعلق جان کر مایوسی
نہیں ہوگی۔ اور میں اپنے کوٹ کی آستین میں سے خرگوش نکال کر دکھانے
کا عادی نہیں ہوں اور نہ مافوق الفطرت باتیں کرنے کا مجھے خبط ہے۔

نویں دسویں گیارہویں اور بارہویں منزل بھی اسی قسم کے
نوادرات سے پُر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان منزلوں کے نوادرات
کلیان چندجی نے نہیں بلکہ اُن کے دو بیٹوں نے جمع کیے ہیں۔ بڑے نے
کم اور چھوٹے نے زیادہ۔ سگریٹ کے ٹن، ماچس کی ڈبیاں، قلم،
شراب کی بوتلیں، اور پتہ نہیں کیا کیا چھوٹی بڑی، معمولی اور غیر معمولی چیزیں
وہاں اکٹھا کی گئی ہیں۔ تیرھویں منزل میوزیم نہ بن پائی، بلکہ لائبریری
بن چکی ہے۔ اس کا سہرا کیلاش چندجی کے سر ہے۔

انھوں نے کتابوں کو ہر چیز پر فوقیت دی۔ ویسے اُن کے بزنس
کی گدی سنبھالتے ہی سیاسی و سماجی اُتھل پتھل زیادہ ہوئی۔ سال بھی تو

سے بھرے کا تھا۔ وہ تو انھیں کا دم خم تھا جو اپنی نیا پار لگا گئے۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو نوادرات بھی نیلام ہو گئے ہوتے اور پھر سوشلزم کا منحوس نعرہ بھی اُن ہی کے کانوں کو سُننا پڑا۔ طبقاتی کشمکش کی جنگ بھی انھیں کو دیکھنی پڑی۔ انھیں ہر بار کھٹکا لگا رہا کہ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی مچھلیاں بڑی مچھلیوں کی غذا بننے کی بجائے انھیں نہ چٹ کر جائیں۔

انھیں اچھے دن دیکھنا نصیب تھا۔ اس لیے وہ عبوری دور ثابت ہوا۔ انھوں نے حفظِ ماتقدّم کے طور پر اپنے قلعے کے گرد گہری خندق کھُدوادی۔ اُس قلعہ کی ہر مُربع انچ دیوار پر فولاد کی چادر منڈھ دی۔ اُنھوں نے اپنے محافظوں کو حکم دے دیا کہ جب کبھی جہاں کہیں کوئی چیونٹی قلعہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے، توپ کا دہانہ کھُل جائے۔ خندقیں پُر کر دی جائیں: اور پھر چیونٹی میں جراءت اور حوصلہ پیدا ہو جانے کی وجہ معلوم کی جائے۔ اور اُس جیسی تمام کمینہ خصلت چیونٹیوں کے وجود کو بارود سے اُڑا دیا جائے۔

جب کوئی تقریب ہوتی، مہمانوں کی تواضع چودھویں منزل پر کی جاتی۔ اس منزل کی خاصیت یہ تھی کہ اُس کی چاردیواری سلائیڈنگ گلاس (SLIDING GLASS) کی بنی ہوئی تھی۔ مہمان جب اس منزل پر قدم رکھتے تو مغرب میں دور تک پھیلے ہوئے سمندر کو، مشرق میں عمارتوں کے سلسلہ کو، جنوب میں چھاؤنی کو اور شمال میں ہینگنگ گارڈن (HANGING GARDEN) کو بھی کیلاش چندجی کی ملکیت سمجھتے۔

کیلاش چندجی ململ کی دھوتی اور ریشم کے کرتے میں ملبوس

شہابی وہسکی کا نازک سا جام تھامے اونچی مسند پر بیٹھے سر محفل اپنے آدرینہ دادا اور پوجیہ پِتا کا حال سناتے۔ ان کی دھرم پتنی مہمانوں کے بیچ ہندوستان کی کلاسیکل عورت کے روپ میں پیش ہوتیں۔ وہ ٹھیٹ ہندو رسم و رواج کے مطابق اپنا بناؤ سنگھار کرتیں۔ کھانے اکثر اپنے ہاتھوں سے پکاتیں اور پکاتے پکاتے اپنی بہوؤں اور بیٹیوں کو کوستی رہتیں کہ وہ مغرب زادیاں ہو گئی ہیں۔ اپنا مان سمان گنوا بیٹھی ہیں۔ انھیں نہ اپنے گھر کی فکر ہے نہ اپنے خاوند کی اور نہ اپنے بچّوں کی۔ بس پارٹیاں ہی پارٹیاں۔ عیش ہی عیش۔

اور ان کے لڑکے کونوں کھتروں میں دبکے شراب کے گھونٹ اور سگریٹ کے کش لگاتے رہتے۔ اور اُن کا ہاتھ کسی گُل بدن کی کمر کے گرد حمایل ہوتا۔ اُن کی بیویاں اپنے مہمانوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتیں۔ پلیٹوں میں ملائی کے کوفتے سرو (SERVE) کرتے کرتے اُن کا آنچل اکثر ڈھلک جاتا اور چاند سورج بھی مہمانوں کی پلیٹ میں آنے کو لپک پڑتے۔

کیلاش پربت میں آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ شہر کے بڑے بڑے بزنس مین، عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والے بڑے بڑے نیتا، اُن کی بیویاں، اُن کی لڑکیاں اس تقریب میں شریک ہیں۔ وہاں آئے ہوئے ہر مہمان کو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ وہ واقعی کیلاش پربت کی کسی موڈرن طرز پر بنی گپھا میں بیٹھے ہیں۔ جہاں کے مناظر بھی حرارت بخش ہیں۔ جہاں سو سالہ پُرانی مدیرا شبنمی پیالوں میں اپسراؤں کا روپ

دھارن کر لیتی ہے اور حلق سے اُترتے ہی زبان سے کلیجے تک کہکشاں گراتی چلی جاتی ہے اور جہاں کی مسندیں عورت کے پہلو کی طرح نرم اور گرم ہیں اور جہاں کھانا اپنے روائتی طرز پر سو فیصدی درست پکتا ہے اور بھاپ میں اپنی خوشبو اُڑاتا جب نتھنوں میں پہنچتا ہے تو پَل بھر کے لیے ذہن کے کروڑوں میل دور واقع گوشہ سے آواز آتی ہے،

"میں کہاں ہوں ؟ میں کہاں ہوں ؟"

"کیا یہ سورگ ہے ؟ کیا یہ سورگ ہے ؟"

کیلاش چند جی کا چہرہ آج کچھ اِس طرح دمک رہا ہے کہ جس طرح چودھویں کا چاند مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں، رفیقوں، چہیتوں اور عزیزوں سے بار بار کہہ رہے ہیں،

"لیجیے اور لیجیے۔ خوب پیجیے۔ مدہوش ہو جائیے۔ ہاں سرکار آپ بھی۔ آپ بھی۔ بڑے دنوں بعد درشن دیے ہیں آپ نے۔ کیا فرمایا ؟ اجی، یہ غریب خانہ آپ ہی کا ہے۔ جب جی چاہے چلے آئیے۔ لیجیے۔ ڈیسٹر.... صاحب کے لیے۔ اور مسز کاپڑیہ آپ زیادہ جھجک رہی ہیں، کم پی رہی ہیں۔ یہ رہا آپ کا گلاس، خالی کیجیے۔ بس جلدی سے۔ شاباش۔ کہیے راؤ صاحب، آپ کیا فرما رہے تھے ؟ ہاں، ہاں ویت نام کے متعلق، خوب صاحب میں بھی کچھ اسی موضوع پر سننے اور سنانے کے موڈ میں ہوں۔ خیر اب آپ خاموش ہی ہو گئے ہیں تو مجھے بولنا ہی پڑے گا۔ آج میں آپ سبھوں کو ایک خوش خبری سناؤں گا، آئیے نا!

آگے آجائیے۔ اور قریب، اور قریب۔"

وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوگئے کہ ان کے جسموں پر لگی مختلف خوشبوئیں کسی گلدستہ کی ملی جلی خوشبو کی مانند ہوگئیں۔

ہلکے ہلکے قہقہہ بلند ہو رہے تھے۔ بات چیت بھی جاری تھی۔ کہ کیلاش چند جی بولے۔

"میرے دوستوں اور عزیزوں، مجھے بڑی چاہ تھی کہ آپ میں سے کوئی آکر مجھ سے یہ پوچھتا کہ آج کی یہ تقریب کس سلسلہ کی ہے؟"

"آپ کی شادی کی سلور جوبلی؟"

"نہیں۔"

"آپ کی گولڈن جوبلی سالگرہ؟"

"نہیں۔"

"آپ کے بزنس کا ایکسپانشن EXPANSION؟"

"نہیں۔"

"آپ کے پریوار کے کسی فرد کا کوئی کارنامہ؟"

"نہیں۔"

"سکم بھارت کی ایک ریاست بن گیا؟"

"آپ کچھ کچھ قریب آرہے ہیں شرمان جی۔"

یہ سنتے ہی محفل قہقہہ زار بن گئی۔

"جنوبی ویت نام پر پرنس سیہانوک کا قبضہ؟"

"آپ تو بہت ہی قریب آگئی ہیں مس شیلا۔"

"کیلاش جی آپ اپنی بات اپنے تک ہی رکھیے۔ مجھے صرف یہ بتائیے کہ کیا آپ کو جنوبی ویتنام سے ہمدردی ہے؟"

"ہمدردی؟ مجھے تو اُن سے دِلی ہمدردی ہے، کماری شیلا۔" شیلا جذباتی ہو کر بولی۔

"تو کیلاش جی آپ اس سلسلہ میں کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے کہ کیا آپ نے ریڈ کراس سوسائٹی کو کوئی ڈونیشن دیا؟"

"ضرور دیا ہے اور اتنا دیا ہے کہ اس رقم کا انکشاف کر دوں تو اِنکم ٹیکس کے افسران مجھے پریشانیوں میں مبتلا کر دیں گے۔"

قہقہہ۔

"دیکھیے صاحبان، مس شیلا نے مجھ سے بڑے دلچسپ سوالات پوچھے اور میں نے اُن کے جوابات بھی دیے۔ لیکن مس شیلا کے لیے، آپ کے لیے اور اپنے لیے میں اِن سوالوں اور جوابوں سے بھی زیادہ دلچسپی کا سامان رکھتا ہوں، پوچھیے کیا؟"

"کیا؟" سبھوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

"آئیے میرے ساتھ۔ میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف دوں گا۔ لیکن یہ تکلیف تھوڑی ہی دیر میں راحت میں بدل جائے گی۔ آپ خوش ہو جائیں گے کیلاش چند نے ہمیں کیا انوکھی چیز دکھائی ہے۔"

یہ کہہ کر کیلاش چند جی سیڑھیوں کی طرف چل دیے اور اُنکے پیچھے تمام لوگ۔ وہ پندرھویں منزل کے آخری زینے پر آ کر رُک گئے

اور نیچے کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولے۔

"آپ ہمیشہ مجھ کو ٹوکا کرتے تھے کہ میں اپنے آدرنیہ دادا اور پوجیہ پتا کا سا شوق نہیں رکھتا۔"

"درست ہے ! RIGHT YOU ARE "

سب ایک ساتھ بولے۔

"لیکن مجھے ماچس کی ڈبیوں، شراب کی بوتلوں، سگریٹ کے ڈبّوں، چھڑیوں، قلموں، فانوسوں، جوتوں اور پتھروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

'کیلاش پربت' کی نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں منزلوں پر کی چیزیں اگر سلامت رہیں تو کافی ہے۔

آج اُن کی اہمیت کم ہے کیونکہ وہ بے جان چیزیں ہیں۔ آج جاندار چیزوں کی قدر ہے جیسے تیندوا، سانپ، مگرمچھ وغیرہ وغیرہ۔

آپ انھیں اپنے گھر میں رکھیے۔ انھیں پالیے۔ انھیں ٹیم TAME کیجیے۔ پھر انھیں اپنے دوستوں کو دکھائیے۔ پالتو کتے اور پالتو بلیاں اب کسی دلچسپی کی حامل نہ رہیں۔ خوں خوار اور زہریلے جانوروں ہی کو پالنا آج سب سے بڑا ہُنر اور فن ہے۔"

سبھوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

سبھوں کی پیشانیوں پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ سبھوں نے اپنے گلے میں خشکی محسوس کی۔ سبھوں نے کیلاش چندجی کو دِل ہی دِل گالیاں دیں کہ سور، حرام زادے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ اب

ہمیں کٹہروں اور پنجروں میں قید یا بالکل آزاد وحشی اور زہریلے جانوروں کا دیدار کرانے لے جارہا ہے۔

سالا۔ اُس کا ایستھیٹیک سینس (AESTHETIC SENSE) مارا گیا ہے۔ اُس کی عقل سٹھیا گئی ہے۔"

"لو میرے ساتھیو۔

یہ منزل اب کبھی خالی نہیں رہے گی۔ اس میں میں نے ایک نادر چیز لاکر رکھی ہے۔ آئندہ جب کبھی آپ اپنے دوستوں، محبوبوں اور یاروں کو میرا میوزیم دیکھنے بھیجیں تو اُن سے یہ ضرور کہیے گا کہ وہ اپنے ساتھ کسی چائینیز ہوٹل سے اُبلے ہوئے چاول اور قیمہ ضرور خرید کر لیتے آئیں۔

"لیجیے صاحب، یہ رہا کیلاش پربت کا سب سے قیمتی نادر۔"

ہال کا بلند و بالا دروازہ کھُلا۔ ہال میں ہزاروں غبّارے، بے شمار رنگین فیتے، سینکڑوں کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ عین وسط میں ایک قالین بچھا ہوا تھا، اُس پر ایک ربر فوم کا میٹریس، جس پر نرم تکیہ اور غیر شکن آلودہ چادر پڑی تھی۔

وہاں کوئی موجود نہ تھا۔

البتہ کمرے کے آخری کونے میں ایک ویتنامی بچہ سُکڑا سِمٹا اُکڑوں بیٹھا خوفزدہ نظروں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

۱۹۷۶ء

ڈر

وہ موٹر مین کیبن کے اُس طرف لٹکا ہوا تھا اور میں اِس طرف۔ کیبن کا دروازہ مقفل نہ تھا، لیکن سخت جرمانے کے ڈر سے ہم اُس کے اندر کھڑے رہ کر سفر نہ کرنے کے بجائے اُس پر لٹکتے ہوئے سفر کر رہے تھے۔

لوکل فاسٹ تھی۔ ماہم ماٹونگا پر نہ رُکی۔ دادر پر رُکی تو ٹین باندرہ اسٹیشن پر سوار ہونے والا مسافر صرف چند لمحوں کے لیے چار اِنچ کے پائدان پر سے اپنا ساٹھ کیلو وزن اُتار کر پلیٹ فارم پر رکھ سکا اور سگنل کا زرد سے سبز رنگ بدلتے دیکھ کر اُس پر پھر سوار ہوگیا۔ پلک جھپکتے میں ہم بھیڑ بکریوں سے لدی لوکل ٹرین پلیٹ فارم کے سائبان سے نکل کر کھُلے میں آگئے اور برق رفتاری سے چرچ گیٹ اسٹیشن کی طرف دوڑنے لگی۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں گرانٹ روڈ اسٹیشن پر ریلوے کا عملہ اپنی

سفید پوشاک میں ہمارا سواگت کرتا ہوا نہ مل جائے۔ عورتوں کے ڈبہ پر سوار، پہلے درجہ میں تیسرے درجے (بھولا اب دوسرا ہوگیا ہے) کے مسافر اور موٹر مین کیبن پر لٹکے ہوئے لوگوں کو ہمیشہ یہی ڈر لگا رہتا ہے۔

لیکن یہ ڈر ایک اور ڈر سے چھوٹا ہے۔ روزی روزگار پر وقت پر پہونچنے کا ڈر ہی مجھ جیسے بدنصیب شہری کا سب سے بڑا ڈر ہے۔ لیکن جب میں سوچتا ہوں کہ مجھ جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں شہری ہر روز اسی ڈر کے زیرِ اثر سفر کرتے ہیں، تو مجھے اُس ڈر کا بھیانک پن کچھ کم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

میرے ٹیکسی ڈرائیور دوست نے بتایا تھا کہ صبح کے وقت سڑکوں پر وہ بھاگم دوڑ مچی رہتی ہے کہ لگتا ہے جیسے سمندر شہر میں داخل ہورہا ہے اور ہر کسی کا کنکشن لوٹ رہا ہے۔ بہر حال میں اُسی ڈر کے زیر اثر سفر کر رہا تھا۔

پچھلی شب کرسمس کی تھی۔ ڈیڑھ بجے ماس ختم ہوا تھا۔ اور پی یاں ہُو، ہا، لاری اپا لاری اپا کی آوازوں کے غباروں میں اُڑتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔ میرا پڑوسی کرسٹی باسٹ بھی جنیگل بیل، جنیگل بیل، جنیگل آل دی وے، کرتا ہوا میرے دروازہ پر آیا تھا۔

"تم سو رہے تھے؟"

میں کہاں سو رہا تھا۔ میں تو اپنے بستر میں پڑا کرسمس منانے والوں کی خوشیوں کا اندازہ لگا لگا کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اپنی مفلسی پر

ماتم کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

"نہیں۔" میں نے کرسٹی کے سوال کا جواب دیا۔

"پھر کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟"

کمرے ہی میں نہیں بلکہ میرے وجود کے اندر اور باہر، ہر سمت، ہر سُو اندھیرا چھایا ہوا ہے اور میں بلّی بن کر اندھیرے میں اُجالا پا رہا ہوں۔

میں نے بستر سے اُٹھ کر پیالو بجا دیا۔ کمرے کے عین بیچ میں چھت سے لٹکتا پچیس واٹ کا بلب روشن ہو گیا۔

ارے اتنا شیبی (SHABBY) گھر رکھا ہے تم نے آج بھی۔"

بلب سے نکلتے زہریلے، چمکیلے، باریک تیروں نے بڑی تیزی سے میری آنکھوں میں گھسنا شروع کر دیا۔

کرسٹی بولے جا رہا تھا۔

"کچھ نہیں تو بیڈ شیٹ ہی بدل لی ہوتی، جھاڑو تو پھیری ہوتی، جالے تو اُتارے ہوتے، پردے تو بدلے ہوتے، کتابوں پر سے دُھول تو جھٹکی ہوتی، یہ جھوٹے برتن، یہ میلے کپ ساسر تو دھوئے ہوتے، ایش ٹرے کی راکھ تو پھینکی ہوتی، مٹکے میں تازہ پانی تو بھرا ہوتا، شیو کر کے دُھلا ہوا نائٹ سوٹ تو پہنا ہوتا۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ چلو آج کرسمس اسی شیبی اسٹیٹ (SHABBY STATE) میں سلیبریٹ کرتے ہیں۔

تو رات پی ہوئی شراب کا اثر صبح تک ذہن پر رہا۔ ٹھنڈے

پانی سے غسل کرنے کے بعد اور آدھا لیمو چُوسنے کے بعد بھی ہلکا ، بہت ہلکا خُمار میرے ذہن پر ، اُس موٹر مین کیبن پر لٹکے رہنے پر بھی طاری تھا۔

بجلی کے کھمبے ، پُلوں کو سنبھالنے والے آہنی شانے ، سیمنٹ اور کنکریٹ کی بنی عمارتیں ، ٹن کی موٹریں ، نشاستہ کے مارے پیڑ پودے ، شہر کی غلاظت کی بدہضمی سے ڈکاریں مارتا سمندر ، اور گندی ہوا میں سانس لیتا گوشت پوست کا بنا اور حسوں کا مارا آدمی میری نظر کے سامنے سے بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ رفتار ہر فاصلے کو کم کر رہی تھی۔ کانکورڈ پلین (CONCORD PLANES) کو (RAF) رائل ایئر فورس کے جہاز سلامی دیتے ہوئے پہلی اُڑان پر روانہ کر رہے تھے۔ پائنیر گیارہ (PIONEER 11) مشتری سے چھبیس[۲۶] ہزار میل کی دُوری سے گذرتے ہوئے باسٹھ کروڑ میل کے فاصلے پر واقع اپنی زمین پر سگنل بھیج رہا تھا۔ افق میں کھڑا (T.V.) ٹاور فلک کی تمام قوت اپنے میں جذب کر رہا تھا۔

موٹر مین کیبن کی دوسری طرف لٹکا ہوا آدمی اپنے ایک ہاتھ میں ٹفن کیریئر (TIFFIN CARRIER) پکڑے ہوئے تھا۔ پُل صراط کا یہ سفر واقعی کٹھن اور صبر آزما تھا۔ لوکل کے رُکتے ہی وہ دوڑنا شروع کر دے گا۔ موٹروں سے بچے گا۔ ہاتھ گاڑی اور گھوڑا گاڑی والوں کی پھٹکار سُنے گا۔ اُن کے یاد دِلانے پر اپنی ماں بہنوں کو یاد کرے گا۔ اور ڈبہ ایک اسکول کے ڈائیننگ ہال کے دروازہ پر رکھے بہت سارے

ڈبوں کے ساتھ رکھ دے گا۔

ٹھیک بارہ بجے ایک نو سالہ لڑکی، گوری چٹی، دُبلی پتلی اپنے سلیٹی رنگ کے یونیفارم پر نیوی بلو سوئٹر پہن کر نکلے گی اور وہ ڈبّہ اُٹھاکر کھانے کی میز پر چلی جائے گی۔ یہ لڑکی کون ہے؟ اُس کی بھانجی؟ بھتیجی؟ بیٹی....

جو کوئی بھی ہو، یہ اُسے بہت چاہتا ہے۔ یا پھر اِس کام کے ملنے والے معاوضہ کو؟

مَیں اُس کیلئے پر اپنا وجود اور کتنی دیر ٹانگے رکھ سکوں گا؟ نہیں سنبھل پاتا۔ اب چھُوٹا تب چھُوٹا۔ اور چھُوٹ ہی گیا۔ میرا لاشہ پٹڑی پر خون آلودہ پڑا ہے۔ وہ ٹرین جس سے میں گرا ہوں، بغیر رُکے چلی گئی ہے۔ ایک اور ٹرین میری لاش پر سے گذرنے کو بڑھتی چلی آرہی ہے۔ دو آدمی ایک غلیظ اسٹریچر لے کر اسٹیشن ماسٹر کے کیبن سے دوڑے ہیں۔ ان دونوں کے چہروں پر بیزاری چھائی ہوئی ہے۔

"بھو... والا آج پھر گر پڑا۔"

"سال کا کوٹا ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ سال ختم ہونے کو آیا ہے۔"

"ہاتھ میں گھڑی کون سی ہے؟" پہلا بولا۔

"رومر ہے۔"

"اُتار لے۔" پہلے والے نے دوسرے کو حکم دیا۔

میری کلائی سے بندھی گھڑی اُتر گئی۔ ہاتھ ہلکا ہوگیا۔ ایک نے میرے پھٹے ہوئے سر کے بالوں کو، دوسرے نے میرے خون آلود جوتوں کو پکڑ کر مجھے اُٹھایا، اسٹریچر پر ڈالا اور وہ دونوں ہو، ہو، ہو، ہو کی بے ہنگم آواز نکالتے تیزی سے دوڑنے لگے۔ ہزاروں کُتّے غرّاتے، سیکڑوں بلّیاں میاؤں میاؤں کرتی پلیٹ فارم سے ہٹتے ہوئے ہمیں جانے کا راستہ دینے لگیں۔ میری گردن اسٹریچر سے باہر لٹک رہی تھی۔ پھٹے ہوئے سر میں سے بھیجے کا کچھ حصّہ باہر بہہ آیا تھا۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ پلیٹ فارم پر لٹکی ہوئی کلاک میں وقت منجمد تھا۔ بارہ[12] بجے تھے۔ وہ لڑکی اپنی کلاس سے نکلی ہوگی اور ڈبوں کے ڈھیر میں سے اُس نے اپنا کھانے کا ڈبّہ اُٹھالیا ہوگا۔

میری جیب کی تلاشی لی گئی۔ پرس نکل آیا۔ سات روپے چار آنے کی رقم۔ ریلوے کا سیزن ٹکٹ اور ایک تصویر، بیوی اور بیٹی کی۔ تصویر میں نے خود اپنے ہاتھوں سے ماتھیران کے ہل اسٹیشن پر کھینچی تھی۔ وہ دونوں اُس پائنٹ (POINT) پر کھڑے تھے جہاں سے غروب کا منظر دیکھا جاتا تھا۔ اُن کے عقب میں سورج ڈوب رہا تھا۔ زردی مائل سُرخی پھیلی ہوئی تھی جو اُس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں سیاہ نظر آرہی تھی۔

"سالا آج کل لوگ اپنے بیوی بچّوں کا بھی خیال نہیں رکھتا۔"

کانکورڈ آواز کی رفتار کی حد کو پھاڑتا، کانوں میں بم کا دھماکہ پیدا کرتا بحیرۂ اوقیانوس پر اُڑ رہا تھا۔ مشتری پر زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ لڑکی ٹھیک بارہ بجے . . . .

بھدّے پیٹ اور بھونڈی ناک کا سیاہ فام اسٹیشن ماسٹر پھر بولا۔

" J. J. اسپتال میں فون کرو۔ ایمبولنس منگاؤ۔ پاس پر لکھے پتے پر اُس کے گھر والوں کو خبر کردو۔"

ایڈورڈ ففتھ (EDWARD Vth.) کے زمانہ کی بنی پتھر کی ٹھنڈی اور وسیع عمارت کے احاطے میں نیلی روشنی جلاتی بُجھاتی ایمبولنس داخل ہوئی۔ مارفیا، آیوڈین، فنائل اور پتہ نہیں کِن کِن دواؤں سے آلودہ ہوا میرے نتھنوں کے قریب سے گُذری۔

آپریشن تھیٹر میں چیر پھاڑ ہوئی۔ میرا دل، پھیپھڑے، کلیجہ وغیرہ نکال لیا گیا۔

آنریری سرجن نے اپنے طلبہ کو میرے جسم میں موجود بیماریوں کے متعلق بتانا شروع کیا۔

" یہ دیکھو گلے میں کینسر۔"

" سینے میں ٹی۔ بی۔"

" ہارٹ پر پیچ (PATCH)۔"

" اپینڈی سائٹیس (APPENDICITIS) بھی۔"

" اور گنوریا بھی اور .... اور پائلس (PILES) بھی۔"

" حیرت ہے یہ شخص اتنے دنوں تک کیسے زندہ رہا؟"

میری لاش سرد خانہ میں پڑی ہے۔

میری بیوی اور بیٹی پُونہ سے لوٹ چکے ہیں اور کرسٹی باسٹ کے ہمراہ میری لاش کو اپنے قبضہ میں لینے کے لیے آئے ہیں۔

اُن کے ہاتھ میں کرونر (CORUNER) کے آفس کا دستخط اور مُہر شدہ کاغذ ہے۔ رُخساروں پر آنسو کی سُوکھتی لکیریں اور گلے میں اٹکی ہوئی ہچکیاں۔

میں سوچ رہا ہوں۔

کل کرسمس تھا۔ کرسٹی خوش تھا۔ آج افسردہ ہے، رنجیدہ ہے۔

مجھے مرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

میں اب بھی اُس کیلیے پر ٹنگا ہوں۔ ٹِن کی موٹریں، سیمنٹ کی عمارتیں، نشاستہ کے مارے پیڑ پودے، گندہ ہوائیں سانس لیتا گوشت پوست کا بنا اور حسّوں کا مارا آدمی میری نظر کے سامنے سے دوڑ رہا ہے اور میں اُس ڈر سے بدستور مغلوب ہوں۔

سنہ ۱۹۷۵ء

شہرِ خطا کا زہر اور اُس کی خانم

پتھریلی دیوار میلوں دور تک یکساں اونچائی لیے کھڑی تھی۔ گز گز بھر لمبے پتھر، جن میں فولاد اور آئی او ڈین کا عنصر زیادہ تھا، دیوار میں چُنے ہوئے تھے۔ وہ اپنے سات سالہ لڑکے کے ہمراہ اُس دیوار کو تاکتی کھڑی تھی۔ ایک ہی نقطہ پر گھنٹوں سے گڑی نظروں نے، اُس کے کیمیائی مرکب میں ہل چل مچادی تھی۔

دیوار کے پرلی طرف کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔

ایک لاش بڑے سے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی، جس پر ایک گنبد نما چھتری کا سایہ تھا۔ بہت سے پھول اُس لاش پر ڈھکی چادر پر پڑے تھے۔ لوگ یکے بعد دیگرے، دبے پاؤں، اُس لاش کے قریب آتے، زیرِ لب کچھ کہتے اور پھر اُس چار دیواری

کے عین وسط میں بنی پُرشکوہ عمارت کے ورانڈے میں بچھی سینکڑوں کرسیوں میں سے کسی ایک پر جا کر بیٹھ جاتے۔

دیوار کے اِس طرف کھڑی ہوئی عورت کل جوان تھی، آج بوڑھی ہو چکی تھی۔ کل اُس کے چہرے پر ایک بھی جھُرّی نہیں تھی، آج اُس کا چہرہ مکڑی کا جالا بن چکا تھا۔ کل اُس کے بالوں میں ایک آدھ ہی سفید بال نظر آتا تھا، لیکن آج اُس کے سر پر راکھ بکھری ہوئی تھی۔ کل اُسے اپنے بیٹے کی ہر ہٹ پیاری تھی، اور آج وہ آدھ گھنٹے سے پیاس کی شِدّت سے تڑپتا پانی کی رَٹ لگا رہا تھا اور یہ اُسے ڈانٹ پھٹکار کر چُپ کرائے جا رہی تھی۔

دیوار کے اُس طرف، اُسی پُرشکوہ عمارت کے ورانڈے میں بچھی سینکڑوں کرسیوں کے بیچ ایک اونچی مسند پر کوئی سن رسیدہ عورت بیٹھی تھی۔ مغموم، مغضوب۔ اُس کے دائیں طرف دس بارہ کرسیوں کے فاصلے پر سیاہ سوٹوں میں ملبوس دو معمر آدمی سرگوشی میں گفتگو کر رہے تھے۔

"AUTOPSY ہو چکی ہے۔ پوٹاشیم سائنائیڈ کا بھاری ڈوز دیا گیا تھا۔"

دوسرے شخص کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"YOU MEAN SOMEBODY'S LIFE WAS ATTEMPTED ?"

"یس !"

کل دیوار کے اِس طرف کھڑی عورت کا پتی جب تک اپنے گھر میں تھا، اُس کا وقت حسبِ معمول طور پر ہی گذر رہا تھا۔ چائے بستر پر ہی

اُس نے پی تھی۔ اخبار بھی اُس نے لیٹے لیٹے ہی دیکھ لیا تھا۔ پہلی سگریٹ بھی اُس نے وہیں پی تھی اور پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوتے ہی وہ وہاں سے غسل خانہ بھاگا تھا۔ نہادھوکر وراندے میں لٹکے پنجرے میں قید طوطے کی طرف بھی وہ اپنی عادت کے مطابق ہی گیا تھا۔

"کچھ بولو گے میاں مِٹھو؟ یا آج بھی خاموش ہی رہو گے؟"

طوطا سعادت مندی سے سر جھکائے، ایک گنوار ہندوستانی کی طرح بیٹھا تھا۔

"بولو نمشکار۔"

طوطے نے جواب دینے کی بجائے اپنی آنکھیں موندلیں۔

"بولو سوسواگتم۔"

طوطا زبان تالو سے لگائے بیٹھا تھا۔

"بولو ستیے میو جیتیے۔"

طوطا یوں خاموش بیٹھا تھا کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اُسے!

"بولو... کچھ تو بولو... تم کتنا چہکتے تھے۔ اور اب یوں چُپ ہو کہ جیسے تمھارے منہ میں زبان ہی نہیں... خیر... یہ امرود کھاؤ۔"

مولی کے پراٹھے، دہی اور ایک پیالہ دودھ کا ناشتہ کر کے وہ گھر سے چلا تو اُس کی پتنی رسوئی گھر سے اُٹھ کر وراندے میں چلی آئی۔ اُس نے سڑک پار کرنے سے پہلے بڑ کے درخت کے نیچے ذرا دیر رُک کر اپنی پتنی کو الوداع کہا۔

وہ آدمی ہی ایسا تھا کہ جس عورت سے بھی اُس کا بیاہ ہوجاتا،

وہ عورت اپنے آپ کو بھاگیہ وان سمجھتی۔ نرم دلی کا اظہار وہ باتوں ہی سے نہیں بلکہ اپنے سلوک سے بھی کرتا تھا۔ وہ جب بیمار ہوتی تو یہ اُس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے رات کاٹ دیا کرتا تھا۔ سر میں درد ہو یا پیر میں، یہ داب دیا کرتا تھا اور بڑی خوبی تو اُس کی باتوں میں ہوا کرتی تھی۔

"اتنا کام نہ کیا کرو۔ اپنی جان ہلکان کیے لیتی ہو۔ جھاڑ پونچھ کا کام میرے لیے چھوڑ دو۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ میں تم دونوں کے کپڑے بھی دھو لوں گا۔"

اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھونا۔ اپنے جوتے اپنے ہاتھ سے پالش کرنا۔ اپنی تھالی خود ہی صاف کرنا یہ اُس کا معمول تھا۔ گھر سے ڈیوٹی پر اور ڈیوٹی سے سیدھے گھر لوٹنا بھی اُس کا معمول تھا۔ اُس نے کسی دوست کو اپنے گھر بُلا کر اپنی بیوی کا دل نہیں دُکھایا تھا۔ وہ اور اُس کی بیوی اور اُن کا بیٹا ایک مثلث بنا چکے تھے اپنی ذات سے۔ اور طے کر چکے تھے کہ اس کا ہر دُکھ ہر سُکھ، ہر آشا ہر نراشا، ہر کامیابی اور اور ہر ناکامی ایک دوسرے ہی کے لیے ہوگی۔ وہ کہا کرتے تھے ایک دوسرے سے کہ ہمارے وجود تین ہیں لیکن اِن تینوں وجود میں ہماری ایک ہی روح موجود ہے۔

"پتاجی، آج کبوتر لانے جانا ہے۔"

"آج کِنگ ایلی فنٹ (KING ELEPHANT) دِکھانے لے چلیے۔"

"کِلے کی فریزر کے ساتھ فائٹ ہے۔ کومنٹری سُنیں گے۔"

"آج گرمی بہت ہے۔ برف کا لڈو لے دیجیے۔"

اُس کی محبّت موم کی طرح ملایم ہے ، شہد کی طرح میٹھی ، دودھ کی طرح پوتر۔ اور جھرنے کی طرح گنگناتی تھی اور اُن پر درختوں کی گھنی چھاؤں کی طرح آسودگی بخش سایہ کر رہی تھی۔

وہ عورت اب اُسی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بچّہ ادھ کھُلی آنکھوں سے اُس کے پہلو میں سر دیے سو رہا تھا۔ دور سامنے پتھرّ کی بنی تاریخی مسجد پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ سڑک پر دھول چکراتی ہوئی اُڑ رہی تھیں۔ کاغذ کے بڑے بڑے ٹکڑے اور درختوں کے سوکھے ہوئے پتے سڑک پر ہوا کے ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔ سارے میں ایک ہُو کا عالم طاری تھا۔

چاروں طرف سے انا الحق کی پُکار ، سڑک کے پتھریلے سینے سے بے شمار بچّوں کے زور زور سے رونے کی آواز اور بازاروں اور کوچوں سے مردوں اور عورتوں کی سینہ کوبی اور آہ و بکا سُنائی دے رہی تھی۔

اُس دیوار کے پیچھے لوگ دست بستہ کھڑے تھے۔ وہ عورت ایک نوجوان لڑکے سے کہہ رہی تھی۔

" قدرت نہ کرے کہ کبھی تم پر بھی ایسا بُرا وقت پڑ جائے۔"

"DON'T WORRY I WILL NIP THE EVIL IN THE BUD"

اُس عورت نے پُر تحسین نظروں سے اسے دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔

لاش ایک سیاہ آہن کی بنی گاڑی پر رکھ دی گئی۔ اُس عورت نے اپنے ماتحت کو نظروں سے اشارہ کیا۔ اس نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے صف کے اخیر میں کھڑے شخص کو اِشارہ کیا۔ جس نے اشارہ پاتے ہی ایک قرارداد پڑھ کر سُنائی،

"ہم سورگیہ راجندر کمار جی کی بیوی اور بچے کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ سورگیہ راجندر کمار جی کی مرتیو نے ہمیں بڑی تباہی و بربادی سے بچایا ہے۔ ہمارا اِتہاس اس مہولتو پورن دُرگھٹنا کے ورنن سے کبھی خالی نہ ہوگا ___"

اُس کے بعد سب نے نعرے لگائے۔ وہ عورت بھی اُس حد تک اُن میں شریک تھی۔

وہ سیاہ آہن کی بنی گاڑی ہولے ہولے چلتی جوں ہی اُس پتھر کی دیوار کے احاطے سے باہر نکلی، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی عورت ہڑبڑا کر اُس کی طرف دوڑی۔ اُس کا لڑکا کچّی نیند سے جاگا، اُس کے پیچھے بھاگا۔ اب گاڑی آگے آگے اور وہ عورت اُس کے پیچھے پیچھے شمسان گھاٹ کو چلے جارہے تھے۔

اُس پتھریلی دیوار کے احاطے میں بنی اُس چھتّیس کمرے والی عمارت کے ڈائنگ روم میں وہ ایک بہت بڑی میز کے گرد بیٹھی

ایک بہت بڑے سوپ کے پیالے سے اُٹھتی ہوئی اشتہا انگیز بھاپ کو اپنے نتھنوں میں جذب کر رہی تھی کہ اُس عورت کا پرسنل سکریٹری ایک شخص کو لے کر اُس کمرے میں داخل ہوا۔

"مادام ہی اِز مسٹر آلو والیہ، یور نیو ٹیسٹر۔"

(MADAM, HE IS MR. ALOOHVALIA, YOUR NEW TASTER)

اُس عورت نے ایک اُچٹتی نظر اُس شخص پر ڈالی اور بڑی تیزی سے سوپ پینے لگی۔ جوں جوں وہ سوپ پیتی گئی، توں توں اُسکے اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے اور جب وہ آخری لقمے لے رہی تھی تو اُس وقت تک اُس کے ذہن کا تمام TENSION زائل ہو چکا تھا۔

سنہ ۱۹۷۵ء

جَیک اینڈ جِل اور میرا بیٹا

وہ صِرف پانچ سال کا ہے۔ لمبا، دُبلا، کالا کلوٹا۔ میری بیوی اسے خوب پڑھانا چاہتی ہے اور اکثر کہتی ہے۔
"یہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا یا انجینئر" وہ یہ بھی کہتی ہے کہ ایک جیوتشی نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا لڑکا بڑا ہو کر اِتنا بڑا آدمی بنے گا کہ اُس سے مِلنے کے لیے ہمیں اپائنٹمنٹ (APPOINTMENT) لینا پڑے گا۔

وہ کہتی۔ "اللہ کِتنا اچھّا ہو جو اُس جیوتشی کی یہ بات سچ ثابت ہو۔"

میری بیوی نے بڑے بُرے دِن دیکھے ہیں۔ وہ سہم گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ دوبارہ اُسے ان مصیبتوں کا سامنا ہو یا اُس کا بیٹا ہی اُن کا شکار ہو۔

جب وہ تین سال کا تھا تو میری بیوی نے اُسے ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔

"یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ وہ تو ابھی اپنا نام بھی تتلائے بغیر ادا نہیں کر سکتا۔"

میری بیوی نے کہا۔

"آپ گرہستی کے معاملے میں دخل مت دیجیے۔ وہاں کوئی پڑھائی ہوتی ہے، کھیل کھیل میں بچہ A، B، C، D سیکھ جائے گا اور اگلی کلاس میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اُس کا FOUNDATION مضبوط ہو جائے گا۔"

پچھلے آٹھ سال سے میں نے گرہستی کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا۔ وجہ اُس کی یہ تھی کہ میں اُسے دلائل اور ثبوت سے قائل نہیں کر پاتا تھا۔ اور جو شخص دلائل اور ثبوت سے قائل نہ ہو اُسے کسی اور طرح سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایسی صورت میں اپنی بات منوانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ لیکن وہ طریقہ میں نے نہیں اپنایا تھا کیونکہ میں ایک مہذب اور شریف آدمی ہوں اور ایسی بلڈنگ میں رہتا ہوں کہ جس میں بیسیوں کمرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کمروں سے عورتوں کی چیخیں اور مردوں کے مارنے پھٹکارنے کی آوازیں اکثر راتوں کو بلند ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن مجھ میں اور میری بیوی میں ایک طرح کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ ایسا سمجھوتہ کہ جس کے بعد COLD WAR شروع ہو جاتی ہے۔ میں گرہستی کے معاملے میں کچھ نہیں

بولتا وہ میرے معاملے میں دخل انداز نہیں ہوتی۔ ویسے میرے ذاتی معاملے آخر ہیں بھی کیا ؟

دوستوں میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا ، رات دیر گئے تک کتابیں پڑھنا۔ اخباروں اور رسالوں کی ردّی جمع کرنا۔ بیوی اور بچے کو کبھی سیر وتفریح کو نہ لے جانا۔ بیوی کے مہمانوں کے گھر میں داخل ہوتے ہی گھر چھوڑ دینا اور فرید کی تعلیم و تربیت سے بے تعلق ہو جانا۔

" A فار ایپل (APPLE) ۔ B فار بال (BALL) ۔ C فار کیٹ (CAT) ۔"

فرید اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہے۔ قاعدہ اُس کی ماں کے ہاتھ میں ہے اور یہ گردان کی جا رہی ہے۔

" ممی یہ چشمہ ۔" فرید ماں کی آنکھوں پر سے چشمہ اُتار لیتا ہے۔

" نہیں بیٹے۔ پڑھتے وقت شرارت نہیں۔ چلو پڑھو۔

' اے فار ایپل' ۔"

فرید چشمہ واپس کر دیتا ہے اور دہراتا ہے۔

" اے فار ایپل . . . . ممی نیپل دو۔"

" نیپل منہ میں رکھ کر نہیں پڑھ سکو گے۔"

" نہیں تو جاؤ میں نہیں پڑھتا۔" فرید پیر پسار دیتا ہے۔ اُس کی ماں نیپل تھما کر آگے پڑھاتی ہے۔

" بی فار بال ۔"

" بی فار بال ، سی فار کیٹ ، ممی بوری کی دُکان سے بال

لے دوگی نا ؟"

" ہاں بیٹے تُو پڑھ تو سہی۔"

دِن گذرتے جاتے ہیں۔ فرید نرسری رائمس (RHYMES)، نمبرس اور الفابیٹس (ALPHABETS) یاد کرلیتا۔ اگلی کلاس میں اُسے ترقی دی جاتی ہے وہ اب K.G. میں ہے۔

سال بھر کے عرصہ میں وہ جوں کا توں ہی رہا۔ نہ تو اس کا قد بڑھا، نہ وہ موٹا ہوا اور نہ ہی اُس کے جسم میں چستی آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ چھن گیا ہو اُس سے، جس کا غم اُسے کھائے جا رہا ہے۔

ایک روز بارش ہورہی تھی۔ اسکول بس کسی وجہ سے اُسے لینے نہ آسکی۔

" آج آپ اسے اسکول چھوڑ آئیے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

ہر ماہ پانچ دِن تک میری بیوی بیمار رہتی ہے۔

میں نے کہا۔ " اچھی بات ہے۔ چلو فرید۔"

فرید کا اسکول پہاڑی پر واقع ہے۔ سینکڑوں عمارتوں کے بوجھ سے دبی پہاڑی پر!

" ابا پیدل چلتے ہیں۔"

" نہیں تمھیں دیر ہوجائے گی۔"

" نہیں، پیدل چلیں گے ابا۔ مائے سویٹ ابا۔"

میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوجاتا ہوں۔ جیسے کسی نے کہا آج مونچھیں خوب تراشی ہیں یا قلم بڑے جاذب انداز سے پکڑتے

ہو یا کھانا بڑے سلیقے سے کھاتے ہو۔ تو میں بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ایسے ہی کومپلی مینٹس (COMPLIMENTS) دے کر خوش ہو جاتا ہوں اور ان کی اکثر حرکتیں جو کہ مجھے ناگوار گذرتی ہیں برداشت کر لیتا ہوں۔

جب میرے لڑکے نے اتنے پیار سے اسکول پیدل چلنے پر اصرار کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔

" اچھا چلو ، لیکن تیز قدموں " میں نے چھتری کھول لی اور فرید کو اُس کے سایہ میں لے لیا۔ بارش بہت ہلکے ہلکے جاری تھی۔ موٹریں ہمارے داہنی طرف سے کیچڑ اُڑاتیں ایک دوسرے کو کوستی کاٹتیں اور کبھی کبھی گالیاں دیتی گذرنے لگیں۔

فرید حیرت واستعجاب کے عالم میں ، اپنے چاروں اُور نظریں دوڑاتا چل رہا تھا۔

اُس روز وہ مجھے کچھ ہینڈسم (HANDSOME) سا لگ رہا تھا۔ سفید اُجلی قمیص ، نیلی نیکر ، سیاہ جوتے اور سفید بے داغ موزے ، اور ان سبوں پر زیب دے رہا تھا اُس کا نیلے پیلے رنگوں سے مزین اسٹیل کا بنا اسکول بیج (BADGE)۔

" ابا آج کون سا دن ہے ؟ "

" وینس ڈے (WEDNESDAY) "

" اور کل ؟ "

" تھرس ڈے "

"مجھے کل چھٹی ہے نا۔"

"ہاں بیٹا۔"

میں باتیں تو فرید سے کر رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ اپنے بچپن کی یادوں میں۔ جب میں بھی اسکول جایا کرتا تھا۔ لیکن میرا اسکول کسی گنجان علاقے میں نہیں تھا بلکہ اُس کے ایک طرف ندی بہتی تھی اور دوسری طرف میدان تھا۔ اسکول سے دو سو قدم پر ایک گارڈن تھا اور اُس گارڈن سے چار سو قدم کے فاصلے پر نصف دائرے میں بنے ننھے مُنّے بنگلے۔

"ہیں —— پ ——" میں نے بجلی کی سی سرعت سے فرید کو اپنی اُور کھینچ لیا۔ ایک بالشت پر سیاہ موٹر کا مڈگارڈ ہمیں ترچھی نظر سے گھور رہا تھا اور فرید گندے پانی کے چھینٹوں سے داغدار۔

"تری ماں کی ..." فرید نے دہل کر گالی دی۔

"نہیں گالی نہیں دیتے۔"

"سالا ہارن نہیں دیتا ابّا۔" فرید غصّے سے بولا

میں اگر کانچ کا بنا ہوتا تو اس وقت کوئی بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ میرا اندرونی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ میرے جسم میں بھونچال آگیا ہے اور میرے سر سے پیر تک ہر ہر چیز ٹوٹ کر چُور چُور ہو گئی ہے۔

گھر پہنچ کر میں نے بیوی سے کہا۔

"ہم اِس شہر میں رہ کر نہ صِرف اپنے آپ پر بلکہ اپنے بچّوں پر بھی ظلم ڈھا رہے ہیں۔"

بیوی ایک دھبّے دار کپڑے کو جھٹک کر کمرے میں تنی رسّی پر سُوکھنے

کو ڈالتے ہوئے بولی۔

"اسی شہر نے آپ کے فن کی قدر کی ہے اور آپ ہیں کہ اسے بُرا

بھلا کہہ رہے ہیں۔"

یہ سچ تھا کہ فلموں میں گانے لکھنے ہی سے ہماری روزی چلتی

تھی ورنہ میں بے کار بھی بہت رہ چکا تھا اور کم تنخواہ کی نوکری بھی میں نے

کئی سال تک کی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ ... نہیں میرا مطلب ہے کہ ..."

میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں کیا بات کہنا چاہتا ہوں۔

"اچھّا ایک کپ چائے تو دو۔" یہ کہہ کر میں نے بات وہیں ختم کر دی۔

اور نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ بارش رُوں رُوں ہو رہی تھی۔ نظر کے

سامنے ناریل کا درخت لہرا رہا تھا کہ میرا ذہن پھر بھٹک گیا۔

اسکول سے دو سو قدم دور واقع باغ میں ایک آم کے درخت

کے نیچے بیٹھا میں کھانا کھا رہا ہوں۔ میرا ماموں درخت کے تنے میں

بنے ایک بڑے سے سوراخ میں سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"اے لو۔ یہ۔" اور دوسرے ہی لمحہ ایک مینا اُس کے پنجے

میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

"ہاؤ سویٹ! (HOW SWEET)" میں نے کھانا چھوڑ کر مینا کو

اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"این آئی این ای ناٹن، ٹی وائے ٹی، نائن ٹی (NINETY)،

فرید دُہراتا ہے۔ "این آئی این ای نائن، ٹی ڈبلیو اے ٹی. نائنٹی، ایف آئی وی ای فائف (FIVE) نائنٹی فائف۔"

فرید یہ ہجّے بھی دہراتا ہے۔

"جیک اینڈ جِل وینٹ اپ دی ہِل، ٹو فیچ اپیل آف واٹر۔"

"ٹیچر یہ جیک اینڈ جِل کون تھے؟"

"THEY WERE BOYS LIKE YOU"

"نہیں ٹیچر وہ ہماری طرح کے نہیں ہو سکتے۔"

"YES FREED, THEY WERE BOYS LIKE YOU".

"نو ٹیچر وہ ہماری طرح کے نہیں ہو سکتے۔"

"DON'T ARGUE FREED OTHER WISE ...."

اُس رات فرید بڑی دیر تک یہ باتیں اپنی ماں کو سُناتا رہا اور بطورِ سزا ایک سو ایک سو مرتبہ اپنی بیاض میں لکھتا رہا:

"I WILL NOT ARGUE WITH MY TEACHER. I WILL NOT...."

کمرے کی بتی بُجھا دی گئی ہے۔ فرید اور اُس کی ماں سو چکے ہیں۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر لیا ہے اور ایک چینی مفکّر کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ کتاب کا نام ہے 'جینے کی اہمیت' (IMPORTANCE OF LIVING)

پڑھتے پڑھتے میرا ذہن پھر بھٹک جاتا ہے۔

مینا میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اُس کے ننّھے سے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں مُوند لیتی ہے۔ پھر میں اُسے ہوا میں اُچھال دیتا ہوں

وہ اپنے پر پھڑپھڑا کر اُڑتی ہے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر آم کے اُسی درخت کی سب سے اونچی شاخ پر آ بیٹھتی ہے۔

چینی مفکر جینے کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں بتا رہا ہے۔ میں کتاب پڑھنے میں محو ہوں کہ اچانک میری نگاہ فرید پر پڑتی ہے جو ابھی ابھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اُن ہاتھوں پر اپنا سر رکھے اور اپنے پیر سکیڑے سویا ہوا تھا۔

اب وہ مراقبے کی حالت میں ہے۔ اُسکی آنکھیں بند ہیں اور وہ بڑبڑا رہا ہے

"ٹیچر جیک اینڈ جِل کون تھے؟"

"نہیں ٹیچر وہ ہماری طرح نہیں ہو سکتے۔"

"نہیں ٹیچر وہ ہماری طرح نہیں ہو سکتے۔"

پھر اُس کا ہاتھ تکیہ پر بائیں سے دائیں یوں چلنے لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنی بیاض پر کچھ لکھ رہا ہو۔

"I WILL NOT ARGUE WITH MY TEACHER, I WILL NOT....."

میں دوڑ کر جاتا ہوں اور فرید کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہوں۔ پھر چاہتا ہوں کہ کوئی گُرز میرے ہاتھ لگ جائے اور پُوری قوت سے میں اُسے گھُمانا شروع کر دوں۔ بُک شیلف، الماری، برتنوں کا شیلف، ٹیوب لائیٹس، دروازے، کھڑکیاں، دیواریں، میری بیوی کا سر اور سیاہ موٹر کا ترچھی نظر سے گھُورتا مڈگارڈ اُس کی زد میں آ کر ٹوٹیں پھوٹیں اور مسمار ہو جائیں۔

سنہ ۱۹۷۶ء

ٹیڈی بیر نے کیا سوچا

سامنے کھیت ہیں اور اُن کے پیچھے پہاڑ ۔ کھیتوں میں فصل لہلہا رہی ہے اور پہاڑوں پر بادل منڈلا رہے ہیں۔ رنگ برنگے پرندے کھیتوں کے کسی حصّے سے اچانک اُڑتے ہیں اور حلقہ باندھ کر پھرتے ہیں اور پھر نیچے اُتر کر روپوش ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہوا فرحت بخش جھونکوں کی صورت چلتی ہے اور جنگل کی وحشی خوشبو اپنے دامن میں سمیٹ لاتی ہے۔ پہاڑوں پر بھیڑ بکریاں سیاہ سفید نقطوں کی طرح بکھری نظر آتی ہے۔ اور جب یہ نقطے دھیرے دھیرے آگے سرکتے ہیں تو ان کے پیچھے پیچھے، سیاہ کمبل اوڑھے کوئی شخص اپنا لمبا لٹھ ٹیکتا آگے بڑھتا ہے۔

میں یہ منظر اور اس جیسے سینکڑوں مناظر اس سلاخوں دار کھڑکی کے سامنے پڑی ہوئی کُرسی پر بیٹھے بیٹھے دیکھا کرتا ہوں۔ جب رات زمین پر اُتر آتی ہے تب بھی یہ کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ جب گھٹا

اُمنڈتی ہے اور پہاڑوں سے ٹکرا کر برسنے لگتی ہے تب بھی یہ کھڑکی کھُلی رہتی ہے۔ جسم پر شروع شروع میں پانی کی پڑتی پھُوار بھلی لگتی ہے لیکن اُس کی زد میں آیا ہوا اپنا جسم مسلسل بھیگتا رہتا ہے تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ اور جب سردیاں شروع ہوتی ہیں اور پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے اور جب وہاں ایک لمبے عرصہ تک کوئی سیاہ نقطہ نظر نہیں آتا تب بھی یہ کھِڑکی کھُلی رہتی ہے۔ اور ہوا سائیں سائیں کرتی میرے جسم سے ٹکراتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اب یا تب برف کا تودہ بن جاؤں گا۔

چونکہ یہ علاقہ سمندر سے دُور ہے اس لیے یہاں گرمی بھی شدّت کی پڑتی ہے۔ سورج اپنی تیز اور نوکیلی کِرنوں سے میرے جسم کو چھیدا کرتا ہے اور میں پہلو بدل کر کسمسا کر رہ جاتا ہوں۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑتا ہے اور بہتے بہتے اُس کرُسی کو تر کر دیتا ہے۔ نہ تو میں اپنی جگہ سے ہِل سکتا ہوں نہ ہی وہ کھڑکی بند ہوتی ہے۔ وجہ اُسکی یہ ہے کہ میں بچّوں کی دِل بستگی کا سامان ہوں۔ روئی کا بنا ہوا ریچھ جِسے ٹیڈی بیر کہتے ہیں۔ میں ایک شخص کا دوست ہوں۔ وہ شخص اِس مکان کا مالک ہے۔ آٹھ کمروں پر مشتمل یہ مکان اور اس مکان میں میں تِن تنہا، مقیدّ۔ یہ قید اور یہ تنہائی مجھے بہت کاٹتی ہے۔ آپ سمجھیں گے کہ مسلسل تنہائی اور قید کے کرب سے گذرتے ہوئے میں اس کا عادی ہوچکا ہوں گا۔ جی، میں عادی ہوچکا ہوں اِس لیے حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ میں نے اِس تنہائی اور قید کے درد کو اپنا مقدّر سمجھ لیا ہے۔ مجھے یہ یقین

ہو چکا ہے کہ میں اس دُکھ کے ساتھ پیدا ہوا تھا اور اسی دُکھ کے ساتھ دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا۔

لیکن کبھی کبھار میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میری تنہائی دُور ہو۔ میں اس قید سے آزاد ہو جاؤں اور کھُلے آسمان کے نیچے چلا جاؤں۔ اور کسی ایسے شخص کا ساتھی بن جاؤں جس کی رفاقت مجھے ہمیشہ میسّر آتی رہے لیکن ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے۔

بات ٹھیک ایک سال پُرانی ہے۔ وہ جولائی کی اٹھائیس تاریخ تھی اور میرا دوست حسبِ معمول ۹ بجے یہاں پہنچا تھا۔ مکان کے داخلی دروازے پر لگے ہوئے قفل کو وہ میرے قریب پڑی ہوئی میز پر رکھتا ہوا بولا:

"یار آج تو میں محض اِس لیے چلا آیا کہ اپنا سالہا سال کا یہ معمول نہ ٹوٹے۔"

مجھے دُکھ ہوا۔ میں جس کا ۳۶۵ دنوں سے منتظر تھا وہ اپنی سالہا سال کی روایت کے مطابق مجھ سے ملنے نہیں آنے والا تھا۔ ہائے .... میرا دوست ذرا بھی وضع دار نہیں! خیر!

"ہیپی برتھ ڈے۔" میں نے رُوکھے لہجے میں کہا۔

سب سے پہلے میں ہمیشہ اُسے سال گرہ کی مبارکباد پیش کیا کرتا تھا۔ اِس مرتبہ بھی میں نے ایسا ہی کیا۔

"تھینک یُو۔" وہ اپنی کرُسی میرے قریب کھِسکاتا ہوا بولا۔

"بارش کی وجہ سے راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں بدستور سامنے دیکھتا ہوا بولا۔
" نہیں۔ اب آدھے سے زیادہ راستہ پکّا بن چکا ہے، اور بقیہ راستے پر پتھر کوٹ دیے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چُپ ہوگیا پھر بولا: " بات سے بات نکلتی ہے۔ میرے لڑکے نے سِیول انجینئرنگ کے پہلے سال میں داخلہ لیا ہے۔"
" کس نے بڑے نے ؟"
" نہیں یار، تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ شروع ہی سے پڑھائی کے معاملے میں ٹھس رہا ہے۔ دوسری کوشش میں بھی وہ میٹرک پاس نہ کر سکا۔"
یہ سُن کر مجھے اُس سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس ذرا سی ناخوش گوار بات کو میں نے نظر انداز کر دیا۔ " اُسے تم اپنے دھندے میں کیوں نہیں شریک کر لیتے۔ ؟"
اُس نے ابھی ابھی اپنے پیروں میں سے جوتے اُتارے تھے، اور اپنی اُنگلیوں کو بار بار سکیڑ سمیٹ رہا تھا۔ " آخیر میں وہی کرنا پڑے گا۔ بس، وہ میٹرک پاس کر لے۔"
وہ میری طرف ذرا سا جُھکتا ہوا بولا۔ " آئندہ ماہ میں جاپان جا رہا ہوں۔ ایک بزنس ڈیل (BUSINESS DEAL) کے سلسلہ میں۔ پچھلے دِنوں وہاں کی مشہور کمپنی SONY کا ایک وفد یہاں آیا تھا۔ اُنھوں نے اتّفاق سے میری کمپنی کا دورہ کیا، بزنس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ LIABILITIES اور ASSETS دیکھیں اور مطمئن ہو گئے۔

وہ دو کروڑ روپیہ اسٹیریو ٹیپ ریکارڈر بنانے کے سلسلے میں میری کمپنی میں INVEST کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی دو سال تک اپنا ٹیکنیکل نو ہاؤ (TECHNICAL KNOW HOW) بھی دیں گے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی امریکہ میں میری فیکٹری کے بنے ٹیپ ریکارڈر فروخت کریں گے۔ تم ہی بتاؤ کیا میں اتنا بڑا بزنس بغیر اپنے بیٹوں کی مدد کے سنبھال پاؤں گا؟"

میں اُس کے بزنس کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوا۔ اب وہ ناخوشگوار بات میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکی تھی۔ "چھوٹا بجائے سِول انجینئر بننے کے اگر الیکٹریکل انجینئر بن جاتا تو بہت اچھا تھا۔"

"اب کیا کیا جائے۔" اُس نے مجھ سے کہا۔ "وہ سِول انجینئرنگ ہی میں رُجحان رکھتا ہے۔ الیکٹریکل انجینئرنگ میں نہیں۔ تو میں نے سوچا کہ اُس پر میں اپنی غرض کیوں لادوں۔ آں۔"

میں نے اُس کے فیصلہ کو سراہتے ہوئے کہا۔ "کاش ہر ماں باپ ایسا ہی سوچیں تو اُن کی نسل تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے۔"

میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ رنگ برنگے پرندوں کا جھُنڈ ابھی ابھی کھیت کے ایک حصّے سے اُڑا تھا اور ایک دائرے میں چکرا رہا تھا۔

"تم نے بڑی دیر سے سگریٹ نہیں پی کیا بات ہے؟" مجھے یاد آیا کہ کھیت میں جب پہلی مرتبہ اُس نے سگریٹ پی تھی تو ٹھسکوں سے دُہرا ہو گیا تھا۔

"ہاں یار، میں تمھیں بتانا بھول گیا کہ مجھے دِل کا دورہ پڑا تھا۔

پچھلے برس بارش کی کمی کی وجہ سے جھیلوں میں پانی کا مناسب مقدار میں ذخیرہ جمع نہ ہوسکا۔ بارش کے بعد چار مہینے بھی بیت نہ پائے تھے کہ سرکار نے پانی کی قلّت کا واویلا مچایا۔ اور بجلی کے استعمال پر پابندی عاید کردی۔ شروع شروع میں ہفتہ میں پانچ روز فیکٹری چلانے کی ہمیں اجازت دی گئی تھی اور دو ہی مہینوں میں صرف چار روز کی پابندی ہم پر عاید کردی گئی۔ اس وجہ سے ہمارے پروڈکشن پر بڑا اثر پڑا۔ اندرونی اور بیرونی ملکوں کے آرڈر اِلتوا میں پڑ گئے۔ مُلکی ڈیلرس اور ایجنسیوں کو تو میں نے ریاست کی صورتِ حال سے آگاہ کردیا اور انھیں تسلّی دی کہ وہ تھوڑا صبر سے کام لیں، حالات نارمل ہوتے ہی اُن کے آرڈروں کی تکمیل کی جائے گی۔ لیکن بیرونی ملکوں کے خریداروں کو ہمارے مسائل سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے؟ وہ تو آرڈر وقتِ مقرّرہ پر پورے نہ ہوں تو آرڈر منسوخ کردیتے ہیں۔ اور دوسرے ممالک کے مینوفیکچروں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اِس طرح نہ صِرف ہماری ساکھ کھوجاتی بلکہ آئندہ آرڈر ملنے کا امکان بھی نہیں رہتا۔ اس لیے میں نے الیکٹرانکس کے چھوٹے چھوٹے مینوفیکچروں سے اپنے آرڈرس مکمل کرائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا ایک بھی EXPORT کا آرڈر منسوخ نہیں ہوا اور فرم نے پچھلے سال ساڑھے سات لاکھ کا نیٹ پرافٹ کیا۔ لیکن اِس تگ و دو میں میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ وقت پر کھانا نصیب نہ ہوا۔ ذہنی انتشار نے مزاج چڑچڑا کردیا۔ اسی دوران میں میں سگریٹ زیادہ پیتا رہا۔ اب شام کو ذہن کے بکھرے ہوئے شیرازے

کو سمیٹنے کے لیے شراب سے کام لیتا رہا۔ اس بدعنوانی کا نتیجہ، ہائے
کِسے معلوم تھا کہ دل کے دورے کی صورت میں نمودار ہوگا۔ تب سے
شراب اور سگریٹ سے پرہیز کرنے لگا ہوں۔"

میں نے اب اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ سر کے سامنے کے حصّے
کے بہت سے بال اُڑ چکے تھے۔ پیشانی اُس کی مضحکہ خیز حد تک کشادہ نظر
آرہی تھی۔ بالوں میں سفیدی نمایاں ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ
حلقے پڑ گئے تھے اور گالوں پر باریک جھرّیاں پڑ چکی تھیں۔ ٹھوڑی کے
پچھلے حصّے پر گوشت کی پتلی سی جھلّی لٹکنے لگی تھی۔ وہ پہلے کی بہ نسبت
اب بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

اُس نے اُٹھ کر کمرے کے کونے میں رکھے اپنے بیگ کو اُٹھایا اور
اُس میں سے سینڈوِچ کے دو پیکٹ نکالے۔ ایک میری گود میں ڈال دیا
اور دوسرا پیکٹ کھول کر سینڈوِچ کھانے لگا۔

"اچھے ہیں نا؟" وہ مُنہ چلاتا ہوا بولا۔

"جب تمھیں پسند ہیں تو ظاہر ہے کہ اچھے ہی ہوں گے۔" میں
مُسکراتا ہوا بولا۔

"بس اب اپنی خوراک سینڈوِچ، ٹوسٹ، اُبلی ہوئی سبزی،
چائے، کافی اور دلیے پر موقوف ہوچکی ہے۔ فروٹس میں صرف سیب اور
انگور کھانے کی اجازت ہے۔ ہاں اُبلا ہوا انڈا اور انار بھی کھا سکتا ہوں۔"

کیوں کہ میں اُس کے چٹورپن سے واقف تھا اس لیے حیرت سے
پوچھ بیٹھا۔ "بس ـــــ اور کچھ نہیں؟"

اُس نے مُسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی نمایاں ہو رہی تھی۔

"تبھی تم اپنے ساتھ اپنا برتھ ڈے کیک نہیں لائے۔"

وہ ہنس دیا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

ہم دونوں اپنی زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکے تھے۔ اور میں اُسے پچھلے پینتیس ۳۵ سالوں سے جانتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ جب جنگ چھڑ گئی تو میدے اور آٹے پر کنٹرول لگا دیا گیا۔ اکثر بیکریاں اسی وجہ سے بند ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود ۲۸ر جولائی کو اُس کا برتھ ڈے کیک چوری چھپے ایک بیکری میں تیار کرایا گیا تھا۔ اور اب میدے اور آٹے پر پہلے جیسی پابندی نہیں ہے لیکن . . . . اس کی غذا پر بندش لگا دی گئی ہے۔

تھرماس میں لائی ہوئی کافی پی کر وہ اپنا منہ رومال سے پونچھتا اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھے اپنی گود میں لے کر بولا۔

"چلو ــــ ذرا سیر کر آئیں۔"

اُس چار دیواری سے باہر آتے ہی آسمان کی وسعت، زمین کے پھیلاؤ، ہوا کے پُرزور دباؤ اور نظر کی کُشادگی نے میرے جسم میں آزادی کی بالکل ویسی ہی پُرمسرّت لہر دوڑا دی جیسی کہ اس کی انگلیوں نے چمڑے کے مضبوط جوتوں اور نائیلون کے کسے ہوئے موزوں سے باہر نکلنے پر محسوس کی ہوگی۔ وہ مجھے کبھی اپنے کندھے پر بٹھاتا کبھی اپنی گود میں اُٹھائے چلتا رہا۔ ننگے پاؤں . . . کبھی وہ دوڑ پڑتا۔

کبھی دھیمے تو کبھی تیز چلتا۔ وہ جھاڑیوں کے قریب سے گذرتے ہوئے چڑیوں کی چہچہاہٹ پر کان دھرتا، تو کبھی کسی جنگلی مرغ کی بانگ سُننے میں کھو جاتا۔ چلتے چلتے رنگ برنگے پھول توڑ لیتا، تو کبھی اُچھل کر کسی درخت کی جُھکی شاخ کے پتے توڑ لیتا۔ وہ کھائیوں میں جھانکتا، اُن میں پتھر لُڑھکاتا، اور پتھروں کو بہت نیچے تک لُڑھکتا دیکھ کر دل میں سنسنی محسوس کرتا۔ بہتے جھرنے پر رُک جاتا۔ پھر لیٹ جاتا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارتا، چلّو بھر بھر کر پانی پیتا۔ لمبی پچکاری مارتا، ننگا ہو جاتا، نہاتا اور کپڑے پہن کر پھر چل پڑتا۔ پانچ میل، سات میل، تو کبھی بارہ میل وہ مجھے اپنے شانے پر اُٹھائے چلتا رہتا۔

حسبِ معمول اُس روز بھی یہی سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن اِتنی شدّت سے نہیں جتنا کہ گذشتہ چونتیس ۳۴ سالوں میں ہوتا رہا تھا۔

چلتے چلتے ہم تھک کر چُور ہو چکے تھے اور ایک ٹیلے پر آبیٹھے تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم دونوں ہی کھائی میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہے تھے کہ وہ اُٹھا اور ٹیلے سے زرا نیچے اُتر کر بَول خارج کرنے کے لیے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ پتہ نہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر، دانستہ یا نادانستہ طور پر میں ٹیلے کے پچھلی طرف لُڑھک گیا اور بیس ۲۰ فیٹ نیچے جھاڑیوں میں جا کر رُوپوش ہو گیا۔

اپنی جگہ پر مجھے نہ پاکر اُسے حیرت ہوئی۔ پھر اُس کی حیرت پریشانی میں بدلنے لگی۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ نیچے اُتر کر اطراف کی جھاڑیوں میں مجھے تلاش کرنے لگا۔

" کہاں چلے گئے تم ؟ ــــ کہاں چلے گئے ؟"

اُس کی پریشانی بڑھنے لگی۔

" کہیں تمھیں کوئی پرندہ تو نہیں اُٹھالے گیا ؟"

" یا تم کھائی میں تو نہیں گر پڑے ؟"

" کہاں ہو تم ــــ کہاں ہو ؟"

اُس کا اضطراب بڑھ کر اب دُکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ ہر امکان پر غور کرتا رہا اور لمحہ بہ لمحہ میری عدم موجودگی سے متعلّق زیادہ دُکھی ہوتا رہا ــــ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برسوں کا ساتھی یوں غائب ہو جائے گا! اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اِتنا لمبا ساتھ یا اتنی پُرانی رفاقت کے باوجود میں اُس سے جُدا ہو جاؤں گا۔ اُس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلسل تنہائی اور قید کا عادی اُس تنہائی کا مداوا اور اُس قید سے رہائی کا طلب گار ہو گا ــــ وہ جامد و ساکت اُسی ٹیلے پر بیٹھا رہا اور میں اُس جھاڑی میں دبکا رہا۔ آخر شام کے سائے لمبے ہو گئے ــــ پنچھی درختوں کے جھنڈ میں بسیرے کو آنے لگے۔ خنکی بڑھنے لگی تو وہ دردناک آواز میں چیخا :

" کہاں ہو میرے دوست ؟ کہاں ہو ؟ کیا مجھ سے رُوٹھ گئے؟ کیا مجھ سے ناراض ہو گئے ؟ کیا مجھے اکیلا ہی اس دُنیا میں چھوڑ گئے؟ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم پر کڑی تنہائی اور سخت قید مقرّر کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تمھارے لیے یخ بستہ اندھیری رات میں کِسی گرم بستر کا انتظام نہیں کیا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ جلتی دوپہر اور

بھیگی شاموں میں میں تمھاری تکلیف کا کوئی چارہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن
میں کیا کرتا میرے دوست! تم ہی تو میری شخصیت کا ایک حصّہ
تھے۔ میرے ماضی کی شاندار یاد تم ہی تو تھے۔ اگر میں تمھیں اپنے ساتھ
رکھتا، تو کوئی شک نہیں کہ تم دُنیا کے تمام آرام و آسائش سے سرفراز
ہو جاتے۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ تم اس دُنیا کی گندی
مادّیت سے اتنے ہی آلودہ ہو جاتے جتنا کہ میں ہو چکا تھا۔ اب میں
تمھیں کیسے سمجھاؤں، کیوں کر یقین دلاؤں کہ میں زندگی کی لاکھ اُدھیڑ بُن
میں لگا رہا لیکن میں ۲۸ر جولائی کو کبھی نہیں بھولا۔ اس ۲۸ر جولائی کی
منزل تک پہنچنے کی خاطر میں نے ہر سال ۳۶۵ دنوں کا کٹھن سفر کیا
ہے۔ چلے آؤ میرے دوست چلے آؤ۔"

یہ سُنتے ہی میرا دل پسیج گیا۔ میں نے سوچا کہ میری قید
اور میری تنہائی سے زیادہ سخت قید اور تنہائی کا وہ شکار ہو چکا ہے اِس لیے
مجھے اپنے دُکھ درد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس کے غم و اندوہ کو پیشِ نظر
رکھنا چاہیے۔ بس یہی سوچ کر میں پھدک کر اُس کے قدموں میں آ پڑا۔
اُس نے مجھے بے اختیار ہو کر چوما، بھینچ کر گلے لگایا۔ پچکا کر پیار
کیا اور پھر......

آج ۲۸ر جولائی ہے۔ میں نے اپنے دوست کی خوشنودی کی
خاطر اپنی آزادی اور رفاقت قربان کر دی ہے۔ نو بج چکے ہیں اور
وہ اب تک نہیں آیا ہے۔ میں منتظر ہوں اُس کا ـــــ نو بج چکے ہیں

ــــــ لمحے بیتے جا رہے ہیں اور وہ اب تک نہیں آیا ہے۔ کیا بات ہے؟ اب میں اُسی سے پُوچھتا ہوں۔

"کیا تم پر کڑا پہرہ مقرر کر دیا گیا ہے یا تمھاری تنہائی جان کُش ثابت ہوئی ہے؟"

میرے سامنے کھیت ہیں اور اُن کے پیچھے پہاڑ.....

۱۹۷۷ء

ہاتھیوں کی قطار

اپنے کمرے کی مغربی سمت میں کھُلنے والی کھڑکی کے پردے سرکانے کے بعد بیرام جی کو جب روشنی کا مینار نظر نہ آیا اور شمال مغرب کی سمت نظر دوڑانے پر اُنھیں مچھیروں کی جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے چراغ بھی نظر نہ آئے تو اُنھوں نے پریشان ہو کر اپنی کمزور اُنگلیوں سے کھڑکی کی کنڈی سرکائی اور بڑی مشکل سے دھکّے دے دے کر کھڑکی کھول دی۔

ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ بارش کی بوچھار کمرے میں آئی اور پلک جھپکتے میں بیرام جی کو شرابور کر گئی۔ اپنی عادت کے مطابق بیرام جی نے گندی سی گالی دی اور بُرا سا مُنہ بنا کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ اِس بوکھلاہٹ میں وہ کھُلی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنا بھول گئے اور کھڑکی بند کر دینے کے بعد بھی انھیں یاد نہ رہا کہ اُنھوں نے کھڑکی کیوں کھولی تھی۔ اُس وقت تو اُنھیں اپنے بھیگے ہوئے کپڑے بدلنے کی فکر کھائے

جار ہی تھی اور ساتھ ہی گیلا فرش پونچھنے کا تھکا دینے والا کام اُن کے سر پر آن پڑا تھا۔ پینسٹھ[65] سال کی عمر کے آدمی کو اپنے معمول سے زیادہ جو بھی کام کرنا پڑتا ہے، وہ اُس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد بیرام جی فرش پونچھ کر اور کپڑے بدل کر، تھکے ہارے ایک آرام کرُسی پر اُس کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گئے۔

بیرام جی گھنٹہ بھر قبل پونہ سے لوٹے تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی اپنے کمرے کی ہر چیز سے گرد جھاڑی تھی۔ فرش پر جھاڑو پھیری تھی۔ پلنگ کی چادر بدلی تھی مٹکے کا باسی پانی پھینک کر تازہ پانی بھرا تھا۔ داخلی دروازہ کی باہری چوکھٹ پر دودھ کی بوتل رکھ چھوڑی تھی اور دروازہ کی باہری کنڈی ہی سے ایک تھیلی لٹکا دی تھی کہ صبح دودھ والا اُس بوتل میں دودھ اور پاؤ والا اُس تھیلی میں پاؤ چھوڑ جائے۔ اُنھوں نے اپنے پن چکّی نما اسٹو میں تیل بھی ڈال دیا تھا کہ صبح نیند سے بیدار ہوکر بغیر کِسی جھنجھٹ کے، اُس پر چائے کا پانی دَم دیا جا سکے۔

انھیں جب ان چھوٹے بڑے کاموں سے فراغت نصیب ہوئی تھی تو حسبِ معمول اپنی تھکن دُور کرنے اور اپنے یارِ دیرینہ کو اپنی واپسی کی اطلاع دینے کی خاطر اُنھوں نے کھڑکی سے پردہ سرکایا تھا۔ اُنھیں توقع تھی کہ سمندر کی طوفانی موجوں میں گھِرا روشنی کا مینار (جِسے سالہا سال سے روزانہ دیکھتے دیکھتے انھیں اُنسیت ہوگئی تھی۔) کِتنا پُراَسرار اور خوفناک لگ رہا ہوگا! لیکن اُنھیں وہاں سیاہی کی پھیلی ہوئی طویل چادر کے سوا جب کچھ اور نظر نہ آیا تھا تو انھیں اپنی آنکھوں

پر دھوکہ ہوا تھا۔ اِس لیے فوراً اُنھوں نے مچھیروں کی بستی پر نظر ڈالی تھی جہاں شام گئے چراغ روشن ہو جاتے تھے اور رات بھر روشن رہتے تھے۔

بیرام جی نے سیکڑوں راتیں اسی طرح اس آرام کرسی پر اُسی کھڑکی کے پہلو میں بیٹھ کر گذار دی تھیں۔ وہ راتیں جب اُن کا بوڑھاپا دِن میں اُن کے جسم کو تھکنے نہیں دیتا تھا اور موت و تنہائی کا ڈر اُنھیں سونے نہیں دیتا تھا۔ یا اُن کے جسم کے مضمحل اعضا، اُن کی جوانی کی لغزشوں، بے توجہیوں اور لاپروائیوں کے برتنے کے سبب درد سے چوُر ہو کر اُن لمحوں میں فریاد کرنے لگتے تو بیرام جی کا دِل گھبرا جاتا اور بے چینی سے وہ صبح کا انتظار کرنے لگتے۔ لیکن رات گذرنے میں جب اپنا وقت لیتی تو بیرام جی اپنے پلنگ سے اُٹھ کر اُس آرام کرسی پر جا بیٹھتے اور سمندر کی ہولناکیوں، چیرہ دستیوں اور ظلم رانیوں میں گھرے اُس روشنی کے مینار کو دیکھ کر اپنا مورل (MORALE) بلند کرتے۔

وہ اپنے دِل کو تسلّی دیتے کہ نہ گھبرا، اس تاریکی سے، نہ ڈر اس تنہائی سے، صبح ہونے کو ہے۔

دیکھ کہ اُن مچھیروں کی جھونپڑیوں میں زندگی ٹمٹما رہی ہے۔

جہاں اُن کے قہقہے، اُن کے بچّوں کے رونے کی آواز، اُن کی عورتوں کی کسک اور دبی دبی سی ہنسی گونج رہی ہے۔

یہ ثبوت ہے زندگی کا جو سمندر کے اتنے قریب ہے۔

اور روشنی کا وہ ثابت قدم مینار،

جیسے سمندر کی جوان لہروں کا بَل ایک بھی جُنبش نہ دے سکا،
تو پھر تو خوف سے کیوں متزلزل ہوا جا رہا ہے۔

یوں سوچتے سوچتے بیرام جی کی آنکھ لگ جاتی اور جب صبح کو
وہ آنکھ مَلتے بیدار ہوتے تو اُنھیں اپنے کو بجائے پلنگ پر پانے کے،
اُس کرُسی پر پاکر حیرت ہوتی۔ پھر وہ مسکرا کر جمائی لیتے، اُٹھ کھڑے
ہوتے اور تپکیر کی ڈبیا ٹیبل پر سے اُٹھا کر دانت مانجھنا شروع کر دیتے۔

جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا، اپنی ماں کی دیکھا دیکھی
تپکیر ہی سے دانت مانجھا کرتے تھے۔ اور اس عمر کو پہونچ کر بھی،
جبکہ اُن کے منہ میں دانت نہیں، دانتوں کے آثار باقی رہ گئے تھے،
وہ بلاناغہ دن میں دو مرتبہ اُن پر تپکیر پھیرا کرتے تھے۔

دانتوں پر تپکیر پھیرتے پھیرتے وہ کمرے کے اِس کونے سے
اُس کونے تک ٹہلتے رہتے۔ دس پندرہ منٹ تک اِس عمل کو جاری
رکھنے کے بعد اُنھیں اپنے پیٹ میں سے کوئی ثقیل چیز نیچے سرکتی محسوس
ہوتی اور جب وہ چیز سرکتے سرکتے کافی نیچے پہونچ جاتی تو وہ لیٹرین
(LATRINE) میں چلے جاتے اور بغیر دروازہ بند کیے بڑی دیر تک
اپنے پیٹ کو سُکیڑتے سمیٹتے رہتے۔ اُنھیں قبض کی دائمی شکایت تھی،
جس روز بھی اُنھیں کھُل کر اجابت ہو جاتی، اُس روز وہ بڑے خوش و خرّم
رہتے، گویا اُن کی دِلی مُراد بر آئی ہو، ورنہ اِس انتظار میں اُکڑوں
بیٹھے رہنے کے وہ طویل لمحے انھیں اپنی زندگی میں کیے گئے کسی بھی
انتظار سے کٹھن لگتے۔

کُرسی پر بیٹھے بیٹھے بیرام جی محسوس کر رہے تھے کہ وہ خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ موسلا دھار مینہہ کھڑکی کے شیشوں پر تڑاتڑ برس رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے کھڑکی کو چوکھٹ سمیت اُکھاڑ دینے پر تُلے تھے۔ سمندر کی چنگھاڑ کے ساتھ ساتھ بادلوں کی گھن گرج بھی سُنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھار بجلی کی چمک میں سامنے میلوں تک پھیلے ہوئے سمندر اور روشنی کے مینار کے بجائے بیرام جی کو ہاتھیوں کی قطار کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ایسی بھیانک رات ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اُنھوں نے کُرسی سے اُٹھ کر پہلے تو گرم سوئیٹر پہنا۔ پھر اپنے کانپتے سر پر ململ کی گول ٹوپی رکھی اور زرتشت کی تصویر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی تیزی سے بُڑبُڑانے کے انداز میں فارسی دعائیہ کلمات پڑھنے لگے۔

دُعا ختم کر کے اُنھوں نے رحم طلب نظروں سے زرتشت کی تصویر کو دیکھا تو اُن کی نظر اس تصویر پر نصب، چوبیسوں گھنٹے روشن رہنے والے سُرخ بلب پر جا پڑی، جو کسی خونی آنکھ کی طرح اُنھیں گھُورتا نظر آیا۔ نظریں فوراً نیچی کر کے وہ پھر اُسی کُرسی پر جا بیٹھے اور تسبیح اُٹھا کر کلماتِ زرتشت کا وِرد کرنے لگے۔

وِرد کے دوران وہ بُڑبُڑائے جا رہے تھے۔

ایسی بھیانک رات تو میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ پینسٹھ سال گذر گئے۔ مجھے اِس مکان میں رہتے ہوئے، لیکن کبھی میں نے اپنے دِل میں اِتنا خوف محسوس نہیں کیا۔

کیا میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔
یا بہت کمزور ہو چکا ہوں۔
یا میرا دل اتنا نازک ہو گیا ہے کہ اِس چھوٹے سے طوفان بادو باراں کا بپا کیا ہوا ہنگامہ برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو مجھے اکیلے نہیں رہنا چاہیے۔ پُونہ سے رخصتی کے وقت زرّیں ٹھیک ہی کہتی تھی کہ کوئی نوکر رکھ لوں جو میری دِن رات دیکھ بھال کرتا رہے۔ یا پھر اُسی کے یہاں اپنے بقیہ دِن کاٹ دوں۔
یہ تو قطعی ناممکن ہے۔
بیٹی شادی کے بعد پرائی ہو جاتی ہے۔ اُس کے گھر تو مہمان بن کر بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہنا چاہیے۔ اور میں تین مہینے بتا کر آ رہا ہوں۔ جمشید کیا سوچتا ہو گا؟
لیکن وہ بھی تو مجھے اپنے باپ کی طرح چاہتا ہے۔ خواہ مخواہ میں ایسے خیالات اپنے ذہن میں کیوں لاؤں؟
میں یہیں بھلا ہوں۔ مجھے کِس بات کی تکلیف ہے یہاں؟
ضرورت کی ہر چیز چوکھٹ پر مِل جاتی ہے۔ جو نہیں مِلتی جا کر لے آتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں اب بھی سلامت ہیں۔ رہا گھر کا کام، سو وہ بھی نہ کروں تو جسم میں چستی کیوں کر آئے؟
اور پہاڑ جیسا دن بھی تو کاٹنا ہے۔
پھر آج کل کے نوکروں کا کیا بھروسہ؟
کب گردن مار دیں اور پُونجی بٹور کر چلتے بنیں۔

اسماعیل موٹر والے کا کیس تو سامنے ہے۔

نا بابا نا ـــ میں باز آیا ان نوکروں سے !

بیرام جی نے محسوس کیا کہ اُن کے ذہن و قلب نے رات کی ہولناکیوں کا اثر قبول کر کے اپنی قوت برداشت بڑھالی ہے۔ وہ کرسی سے اُٹھے اور میز کی دراز کھول کر، اس سُرخ بلب کی روشنی میں تین مہینے پہلے خرید کر رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگے۔ چند لمحوں میں ڈن ہِل کا لمبا چوڑا پیکٹ اُن کے ہاتھ آیا۔ پھر اُنھوں نے اسٹو کے پاس رکھی ہوئی ماچس اور پلنگ پر پڑا ہوا بلینکیٹ اُٹھایا اور کرُسی پر آ بیٹھے۔

پہلے تو اُنھوں نے بلینکیٹ کھول کر اپنے پیروں پر پھیلا دیا اور اُس کا ایک حصّہ اپنے سینہ تک لے آئے۔ سگریٹ کی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگایا اور ماچس جلا کر اسے سُلگایا۔ پہلے ہی کش کے ساتھ تمباکو کی عربی کھجور جیسی خوشبو اُن کے نتھنوں کی راہ پھیپھڑوں میں پہونچی تو انھیں ایسا سکون ملا کہ وہ بھیانک طوفان اچانک تھم گیا ہو اور رات کی تاریکی اچانک سمٹ گئی ہو اور سمندر کی اٹھکھیلیاں کرتی لہروں میں گھرا روشنی کا مینار اُن سے باتیں کر رہا ہو۔

باتیں بیرام جی کی زندگی کا سب سے بڑا نجز تھیں۔ اُنھیں باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ باتیں . . . . ؟ اچھّی اور بُری باتیں۔ بے تکی اور SENSIBLE باتیں، اخباری اور کتابی باتیں۔ گھریلو اور دُنیاوی باتیں۔ سماجی باتیں، مذہبی باتیں۔ سنیما اور تھیٹر کی باتیں،

سطحی باتیں، گمبھیر باتیں، دِل کی باتیں اور خاص معاملات کی باتیں۔ وہ باتیں کرنے کے جُرم میں اپنے اسکول کے زمانے میں کئی بار کلاس رُوم سے باہر نکالے جا چکے تھے۔ اِنھیں باتوں نے اُن کی اسکول کی رپورٹ پر CONDUCT کے کالم میں FAIR سے بہتر کبھی کوئی ریمارک آنے نہیں دیا۔ ایک مرتبہ اپنے دوست کے ہمراہ اُس کے مکان کے سلسلہ میں چلنے والے کیس کی HEARING کے دوران باتیں کرتے ہوئے جج کو ڈسٹرب کرنے کے جُرم میں کورٹ روم سے باہر نکال دِیے گئے تھے۔

کلکٹر کے آفس میں اُنھیں لوگ اِسی لیے چاہتے تھے کہ وہ بڑی دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور آفس کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتے تھے۔ کلکٹر نے اُنھیں کئی بار ٹوکا تھا کہ وہ اپنے اردگرد اسٹاف ممبرز کو ہر وقت جمع نہ رکھیں، آفس کے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ لیکن ہر بار بیرام جی اپنی سرکی ہوئی کمانی دار عینک NOSE BRIDGE پر اور جُھکی ہوئی ٹوپی سر پر ٹھیک سے جما کر مُسکراتے ہوئے اپنے باس کو دیکھتے اور TYPICAL پارسی انداز میں کہتے۔

"جا دا دے نی ڈیکرا، بچّاڈ چھے، ماری پاسی پرابلمو لیئنی آویا کری چھے، اُوں اے لوگو نے ADVICE آپو چھوں۔"

یہ سُن کر کلکٹر بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر پاتا اور اُنھیں ہاتھ کے اشارے سے DISMISS کر دیتا تھا۔

ایسا باتونی شخص اپنے بُڑھاپے کے حصار میں قید، اپنے نامساعد حالات کا شکار، لائٹ ہاؤس سے باتیں نہ کرے تو کس سے

کرے؟ خود نہ بڑبڑائے تو بچپن سے پرورش پائی ہوئی، اس لو انا خواہش کی تکمیل کیوں کر کرے؟

پچھلے دس سالوں میں اُن کی زندگی میں جتنے مدّو جزر آئے، اتنے کسی سمندر میں نہ آئے ہوں گے۔ ماں باپ گذر رے، اُن کے پیچھے بیوی بھی چل دی۔ اکلوتی بیٹی جو شادی کے بعد بھی ساتھ رہا کرتی تھی، اپنے میاں کے نئے کاروبار کے تحت دوسرے شہر میں منتقل ہو گئی۔ نوکری سے ریٹائر ہوئے تو روز کے مِلنے جُلنے والوں کے چہرے دیکھنے کو ترس گئے۔ مہنگائی بڑھی اور پنشن ناکافی ہوئی تو پُرکھوں کا مکان آدھے سے زیادہ کرایہ پر اُٹھا دیا۔ غرض یہ کہ بھرا پُرا گھر اُجڑ گیا۔ ہنستی کھیلتی زندگی پر خزاں کی افسردگی چھا گئی۔ نہ یار نہ رشتہ دار، کوئی بھولے سے نہیں پھٹکتا۔ پاس پڑوس والے اُنھیں جھکّی سمجھ کر کنیّ کاٹتے یا کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو صرف

"بیرام جی کیم چھو؟ سارو چھو۔"

اور سائٹب جی کہہ کر رُخصت ہو جاتے۔

کون تھا جس کی رفاقت میں یہ چند گھنٹے گذار سکتے؟ یا اپنے دِل کی باتیں کہہ کر اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کرتے۔ گِنتی کے چند لوگ تو تھے جن سے اُنھیں چوبیس گھنٹوں میں واسطہ پڑتا تھا۔ کئی بار اُنھوں نے دودھ والے، پاؤ والے اور اخبار والے کو اپنی باتوں میں اُلجھانا چاہا۔ لیکن وہ کب تک اِس بوڑھے کی باتوں میں اپنے کام کے وقت دِلچسپی لیتے؟ تھوڑی دیر تک تو وہ بڑے صبر سے اُن کی باتیں سُنتے اور پھر دوسروں کے گھر اپنے مال کی

ڈیلیوری میں دیر ہو جانے کا بہانہ بنا کر رُخصت ہو جاتے۔

بیرام جی کے معمول میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ناشتہ کرکے ہوا خوری کو نکلا کرتے تھے۔ برس کے بارہ مہینے، اُن کی صبح کی سیر اٹل تھی۔ برسات میں چھتری اور سردی میں اوور کوٹ اوڑھے وہ نیپنسی روڈ (NEPEON SEA ROAD) سے ہارکینس روڈ تک جاتے۔ یہ فاصلہ کسی صورت میں دو میل سے کم نہ تھا۔ لیکن بیرام جی خراماں خراماں اسے طے کر لیا کرتے تھے۔

دراصل اُنھیں اس علاقہ سے دلی لگاؤ تھا اور کیوں نہ ہوتا یہ لگاؤ؟ بیرام جی کا بچپن اِسی علاقہ میں گُذرا تھا۔ کیسا شاداب اور پُر فضا مقام تھا وہ! سرسبز و شاداب پہاڑیوں پر واقع! سمندر سے گھرا ہوا، جہاں بل کھاتی ہوئی سڑکیں اوپر سے نیچے کسی جھرنے کی صورت بہتیں۔ دُور دُور بنے ہوئے بنگلوں کو نیچے سے دیکھ کر گمان ہوتا کہ گویا ایک دوسرے سے غیر متعارف انگریز ٹوپیاں پہنے ہوئے کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور رات جب گیس کے ہنڈولے ان پُر پیچ راستوں پر روشن ہو جاتے تو نیچے سے دیکھنے والا سمجھتا کہ بہت سے جگنو اُس پہاڑی پر مختلف قطاروں میں بیٹھے ہیں۔

اُن دنوں اِس علاقہ کی آبادی بہت کم تھی۔ وہاں رہنے والے زیادہ تر لوگ بڑے بڑے سرکاری دفتروں میں کام کرتے تھے۔ اُن کا خاندان بڑا ہوتا تھا۔ کم از کم پندرہ بیس افراد پر مشتمل۔ ایک شخص کماتا، دوسرے کھاتے تھے۔ اُنھیں فکر کاہے کی تھی؟ وہ زمانہ آج کا زمانہ

نہیں تھا، خوف و اندیشوں کا زمانہ! وہ بے فکری کا زمانہ تھا۔

بیرام جی کا باپ کلکٹر کے دفتر میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ ہزار روپے تنخواہ، موٹر گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر، سب کچھ تو تھا۔ بیرام جی J. B. PETIT ہائی اسکول میں پڑھنے کو جایا کرتے تھے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی، تو یہ اپنے دوستوں کو، جو بمبئی کے گرد و نواح میں رہتے، اپنے گھر دن گذارنے بلا لیا کرتے۔

مکان کے پچھواڑے کھلا میدان تھا۔ بیرام جی اور اُن کے دوست وہیں اسٹمپس گاڑ کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ کھیلتے کھیلتے دوپہر ہو جاتی تو کھانا بیرام جی کے گھر ہی پر ہوتا، جس کا انتظام اُن کی ماں اپنی نگرانی میں کرتیں۔ چکن دھان سک، کباب، پاپڑ اور کچومر، پھر اُنھیں آئسکریم یا فروٹ جیلی پیش کی جاتی۔

خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد بیرام جی اور اُن کے دوست بنگلہ کے ورانڈے میں صوفوں پر دراز ہو جاتے، گراموفون آن کر دیا جاتا اور سہگل کا گیت "سو جا راجکماری.... سو جا"، بڑے شوق سے بار بار سُنا جاتا۔ سہ پہر کو چائے پی کر یہ سب اپنے اپنے گھروں کو رُخصت ہوتے۔

کہتے ہیں کہ کھلے میدان سے آسمان کا نظارہ کرنے کا لطف صرف وہی شخص جانتا ہے جو میدان کی ہری گھاس پر دو گھنٹے تک لیٹا ہو اور مسلسل آسمان کو تکتا رہا ہو۔ ایک بے کنار وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ نیلے آکاش میں سفید بادلوں کے ٹکڑے رُوئی کے گالوں سے اُڑتے چلے

آتے ہیں، اور بہت بلندی پر اُڑتی ہوئی چیلیں اپنے پھیلے ہوئے پروں کو جنبش دیے بغیر اپنا وزن سنبھالے سمندر میں چلنے والی کشتیوں سی لگتی ہیں۔

بیرام جی اکثر میدان میں لیٹے آسمان کی اَور دیکھا کرتے تھے۔ اور غروب کا منظر؟ ہاں، وہ بھی۔ انھیں طلوع اور غروب دونوں دیکھنے کا شوق تھا۔ اُن کے لیے روزانہ سورج اپنے سنہری تھال سے چاندی کے ہزارہا تاروں کو لُٹاتا، مشرق سے مغرب کا سفر کرتا تھا، اور اُن کی زندگی کے دِن اُس کے جلو میں گذرا کرتے تھے۔

گذشتہ دس سالوں سے بیرام جی محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے کھیل اور تفریح کے میدان، وہ بنگلے، وہ پہاڑیاں، وہ بل کھاتی سڑکیں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جارہی ہیں اور اُن کی جگہ دیو پیکر، آہنی سنگلاخ کی سیدھی اور سپاٹ عمارتیں کھڑی ہوتی جارہی ہیں۔ رفتہ رفتہ قدرتی حُسن پامال ہورہا ہے۔ اب نہ تو سبزہ ہے نہ درخت، نہ پھُول ہیں نہ پتے۔ نہ چڑیاں ہیں نہ گلہریاں۔ نہ تتلیاں ہیں نہ بھنورے۔ نہ گرگٹ ہیں نہ ٹڈے، کچھ بھی تو نظر نہیں آتا! او گاڈ، وہ سب کہاں گئے؟ کیا ہوئے؟ اُنھیں زمین کھاگئی یا آسمان نگل گیا؟ کئی دِنوں تک وہ بڑے فکرمند رہے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہورہا ہے؟ کتنا ہوچکا ہے؟ اور کتنا ہونا باقی ہے؟

اِس کی کوئی انتہا بھی ہے؟ اِس کا کوئی خاتمہ بھی ہے؟

یا یہ اسٹیل اور سیمنٹ کا جنگل جو ہر لمحہ اور ہر پل اپنے پھیلاؤ میں بڑھتا ہی جارہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اِنسان کی ہر سانس کا

احاطہ کرلے اور اُس کا جینا دُوبھر کردے۔ یہ تو اُس کے ذہن، قلب اور رُوح پر ظلم کا پہاڑ بن کر ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے اس کی مخالفت کرنی ہی پڑے گی۔

اُنھوں نے مختلف اخباروں کے ایڈیٹروں کو خط لکھے اور بڑی مدلّل باتوں سے ثابت کیا کہ آدمی اپنی خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں شہر کے ساتھ بدفعلیاں کررہا ہے۔ اگر فوراً نئے مکانات کی تعمیر نہیں روکی گئی، خودغرض عمارتی ٹھیکیداروں کے حوصلوں پسپائی نہیں کی گئی، اُن کے منصوبوں کی مذمت نہیں کی گئی، تو یہ شہر اسٹیل اور سیمنٹ کا جنگل ہوکر رہ جائے گا جس میں موٹروں اور بسوں کے ہیبت ناک جانور دوڑتے پھریں گے جن سے انسان خوف زدہ ہوکر سمندر میں کُود پڑے گا۔

بیرام جی کے خطوط ایڈیٹروں نے بڑے اہتمام سے شائع کیے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اُن کے خط کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگایا کہ اگر اس سلسلے میں شہر کے دوسرے معزز شہری کوئی مہم چلانا چاہیں تو ادارہ اُن کے منصوبوں کو عام کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

یکے بعد دیگرے سیکڑوں خط بیرام جی کے خیالات کی تائید میں شائع ہوئے۔ بیرام جی کی چیئرمین شپ میں ADHOC کمیٹی بنائی گئی۔ ایک جنرل باڈی کے تحت شہر کے مختلف اداروں کے لیے کئی چھوٹی بڑی کمیٹیوں کا قیام ہوا۔ اِن کمیٹیوں نے ہر بنتی ہوئی نئی عمارت پر اپنا مورچہ بھیجا۔ عمارتی ٹھیکیداروں کے دفتروں کے سامنے بھوک ہڑتالیں

رکیں اور اِسی کاز کے لیے خود سوزی کرتے ہوئے دو تین ممبروں کو پولیس نے گرفتار کیا۔ لیکن کوشش لاحاصل رہی۔

لائنز کلب نے اپنے ہر علاقہ میں سیمینار منعقد کیے، لیکن لاحاصل، کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ عمارتیں بنتی تھیں، بنتی گئیں اور — آئے دِن ذرا ذرا سی جگہوں پر بنتی گئیں۔

سیر کو جاتے ہوئے بیرام جی جب بھی کسی عمارت کی بنیاد پڑتے دیکھتے تو اُن کے دِل سے آہِ سرد نکل پڑتی تھی۔ اب تو اُن کا جی سیر میں بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ جس حُسنِ قدرت کو دیکھنے نکلا کرتے تھے، وہ تو ان عمارتوں کے آہنی وجود تلے دفن ہو چکا تھا اور بجائے اُس کے اُنھیں اُن عمارتوں کی بالکنیوں میں کوئی دانت مانجھتا، کپڑے سُکھاتا، یا شب خوابی کے لباس میں چائے پیتا نظر آتا تھا۔ راستہ پر موٹر گاڑیاں، اور بسیں دندناتی ہوئی اُن کے بہت قریب سے گُذر جاتیں اور بیرام جی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑا جاتی تھیں۔ وہ انسان کے اِس ظالمانہ رویّہ پر لعنت بھیجتے گھر لوٹ جاتے تھے۔

اب تو اُنھوں نے صبح کی سیر کو بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ بس اُسی کھڑکی کی بغل میں بیٹھ کر مچھیروں کی شکار پر روانگی، آبی پرندوں کی اُڑان اور غروب کا منظر دیکھا کرتے تھے اور اپنے ہم دمِ دیرینہ کو اپنے دِل کی باتیں سُنا کر تسکین پا لیتے تھے۔

دِن کا اُجالا دبے پانوں اُس کھڑکی کی راہ بیرام جی کے کمرے میں

داخل ہوا تو اُس نے بیرام جی کو آرام کرسی پر سوتا پایا۔ اُن کے چہرے پر سفر کی تکان، رات کی ہولناکیوں کا اثر اور خطرناک اندیشوں کا ڈر، کچھ بھی تو نہ تھا۔ اُن کی پائینتی کے قریب کئی جلے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور BUTTS پڑے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بیرام جی نیند سے بیدار ہوئے تو اُنھیں پھر اپنے آپ کو اُس کرسی پر پاکر حیرت ہوئی۔ اُنھیں یاد آیا کہ گذشتہ رات اُنھوں نے کتنے کرب و اضطراب میں کاٹی۔

"اُوں راتڑے پونہ تھی آدمی نے تم نے ترنج INFORM کروانو ہتھوں پن ہیوی اسٹورم تھیا۔ پچھی اوں تم نے جوئی نئی شکوں"

یہ کہتے کہتے بیرام جی نے اپنے دوست کی جانب دیکھا، اُن کا مُنہ کچھ کہنے کو کھُلا، لیکن وہ کھُلا کا کھُلا ہی رہ گیا۔ کسی نے اُن کی رُوح کو اُنگلی میں لپیٹ کر باہر کھینچ لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے دِل پر ہاتھ رکھے کرسی پر گر پڑے۔

پھر اُنھیں محسوس ہوا کہ اُن کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے اِسٹیل اور سیمنٹ کے ہاتھیوں نے اپنی سونڈیں آہستہ آہستہ بلند کرلی ہیں اور اپنے دیو پیکر وجود سے اُنھیں کچل رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۷۴ء

پرنٹر پبلشر فاطمہ قمر نے پیراماؤنٹ آفسیٹ پریس، ۱۳۔ میونسپل انڈسٹریل اسٹیٹ، ۴۲ الف کلارک روڈ، جیکب سرکل، بمبئی ۴۰۰۰۱۱ میں چھپواکر ۱۴۸، مہرآباد، 31 ہل روڈ بمبئی ۴۰۰۰۵۰ سے شائع کیا۔
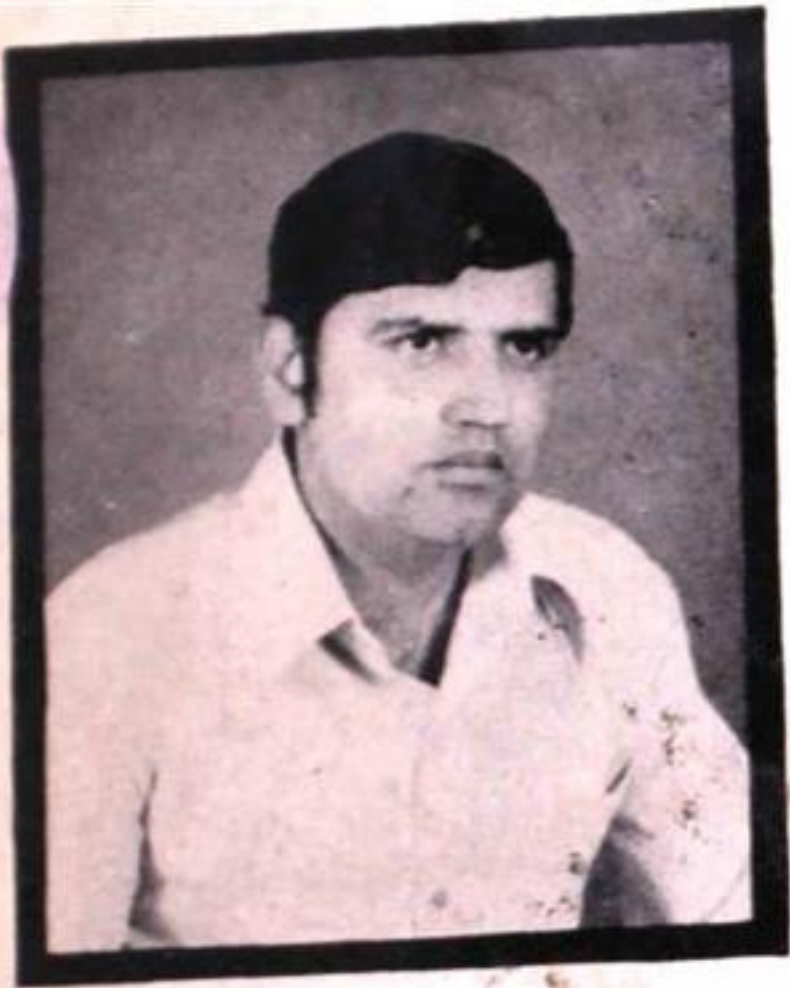
——— میں افسانے کو حقائقِ زندگی سے الگ نہیں سمجھتا۔ میرے یہ افسانے جو آپ ملاحظہ فرمائیں گے، قِصّے نہیں ہیں، بلکہ واردات ہیں۔ مَیں نے جو پڑھا، میرے پڑھے لکھے بزرگوں نے اُس کی تائید کی۔ میں نے جو دیکھا، اُسے اپنے مطالعے کی کسوٹی پر پرکھا اور مجھ پر جو گذری اُس نے پہلی دو باتوں کی حقیقت کو تقویت پہنچائی۔ نتیجے میں میرے درد اور میری کسک نے مجھے کچھ لکھنے پر اُکسایا اور پھر جو کچھ مَیں نے لِکھا، شاید وہ افسانہ بنا۔

سیاسی، معاشی اور مذہبی مفادات کی وجہ سے انسانی فکر پر جو پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں، مَیں نے اُن سے بغاوت کی ہے۔ اسی لیے میری تحریر بہلاوے کی مٹھاس کم ہے اور شاید حقیقت کی تلخی قدرے زیادہ۔ چوں کہ معاشرہ بیمار معاشرہ ہے اس لیے ممکن ہے کہ میرے افسانے چٹخارہ پیدا نہ کریں لیکن مجھے امید ہے کہ وہ میڈیسنل ڈوز ثابت ہوں گے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں یہ میری اپنی رائے تھی، مگر میں اپنے سنجیدہ قارئین کی رائے کو بہتر اور محترم تسلیم کروں گا۔

——— انور قمر